بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مذہب اور دین کا تقابل

مذہب	دین
مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسکا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
مذہب میں ہر فرد کی منزل اپنی اپنی نجات ہوتی ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؟	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موجب ہے۔
مذہب، عقل کے دیئے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ جلے۔	دین عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنیاد پر منواتا ہے۔	دین اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
مذہب، لوگوں کو روشنی سے، تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یخرجونھم من النور الی الظلمٰت (۲/۲۵۷)۔	دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ یخرجھم من الظلمٰت الی النور (۲/۲۵۷)۔

مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پر چلتے جاؤ۔

دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن حرام است

(اپنے تیشے سے اپنا راستہ خود تراشو۔
دوسروں کے بنائے ہوئے پامال راستوں پر چلنا حرام ہے۔)

مذہب، عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔

دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی سطح بلند کرتا ہے۔

اس لئے مذہب، ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

دین تیشۂ براہیمیؑ سے ہر قدیم اور جدید بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

دین، خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بیباکی کا مسکن بناتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔

دین اسے ایک خدا کے قوانین کا اطاعت گزار بنا کر دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

مذہب، مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

دین مادہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت کا وعدہ دیتا ہے۔

اور دین، اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔

مذہب، تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

مذہب' کمزوروں' ناتوانوں' مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد' ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔

دین' ظلم واستبداد۔ سلب ونہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور غاصب حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔

مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ: ؎

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ مشکل حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ: ؎

شب' گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے

مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ: من حرم زینة الله التی اخرج لعبادہ (۷/۳۲) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔

مذہب' موت کی سسکیاں ہیں۔

دین' زندگی سے بھرپور ہنسی ہے۔

مذہب ایک خوابِ پریشاں ہے۔

دین' زندہ حقیقت ہے۔

مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم هو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر' مردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔

مذہب انسانیت کی موت ہے۔

دین[1] دم جبرئیل۔ دین دلِ مصطفیٰ
دین فقیہہ حرم۔ دین امیرِ جنود
دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

دین ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
دین خدا کا رسول۔ دین خدا کا کلام!!!
دین ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
دین سے نورِ حیات۔ دین سے نارِ حیات

☆☆☆☆☆☆☆☆

[1] اصل اشعار میں ''دین'' کے بجائے ''عشق'' کا لفظ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مذہب اور دین کا تقابل

مذہب	دین
مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔
مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسکا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔	دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
مذہب میں ہر فرد کی منزل اپنی اپنی نجات ہوتی ہے۔	دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں؟	دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	دین، انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو نکھارنے کا موجب ہے۔
مذہب، عقل کے دیئے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ جلے۔	دین عقل کے دیئے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنیاد پر منواتا ہے۔	دین اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔
مذہب، لوگوں کو روشنی سے، تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یخرجونھم من النور الی الظلمٰت (۲/۲۵۷)۔	دین، انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ یخرجھم من الظلمٰت الی النور (۲/۲۵۷)۔

مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے، آنکھیں بند کئے پامال راستوں پر چلتے جاؤ۔

دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ: ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن حرام است

(اپنے تیشے سے اپنا راستہ خود تراشو۔
دوسروں کے بنائے ہوئے پامال راستوں پر چلنا حرام ہے۔)

مذہب، عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔

دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی سطح بلند کرتا ہے۔

اس لئے مذہب، ہر زمانے میں نئے نئے بت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔

دین تیشۂ براہیمیؑ سے ہر قدیم اور جدید بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

دین، خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بیباکی کا مسکن بناتا ہے۔

مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔

دین اسے ایک خدا کے قوانین کا اطاعت گزار بنا کر دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔

مذہب کشمکشِ حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

مذہب، مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔

دین مادہ کی تسخیر سے، انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔

مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت کا وعدہ دیتا ہے۔

اور دین، اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنت حاصل کرتا ہے اور وہاں بھی۔

مذہب، تقدیر کے بہانے انسان کو یکسر بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

مذہب' کمزوروں' ناتوانوں' مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد' ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔	دین' ظلم واستبداد۔ سلب ونہب کے خلاف اعلانِ بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور غاصب حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے۔
مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دیکھتا ہے اور انسان میں ایسی مایوسانہ ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ:۔ آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں	دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان کی نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ مشکل حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ:۔ شب' گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
مذہب' کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے۔	دین اعلان کرتا ہے کہ: من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہ (۷/۳۲) وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔
مذہب' موت کی سسکیاں ہیں۔	دین' زندگی سے بھرپور ہنسی ہے۔
مذہب ایک خوابِ پریشاں ہے۔	دین' زندہ حقیقت ہے۔
مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دیتا ہے۔	دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔
مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔	دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر' مردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔

مذہب انسانیت کی موت ہے۔

دین[1] دم جبرئیل۔ دین دلِ مصطفیٰ
دین فقیہہ حرم۔ دین امیرِ جنود
دین کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

دین ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام
دین خدا کا رسول۔ دین خدا کا کلام!!!
دین ہے ابن السبیل، اس کے ہزاروں مقام
دین سے نورِ حیات۔ دین سے نارِ حیات

☆☆☆☆☆☆☆☆

[1] اصل اشعار میں ''دین'' کے بجائے ''عشق'' کا لفظ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

حضورﷺ کے بعد حضورﷺ کا قائم مقام کون ہے

شروع سے سنت اللہ یہی چلی آ رہی ہے کہ انسانیت کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین نازل ہوتا تھا۔ چونکہ اس وقت معاشرہ بہت سادہ تھا اور زندگی بسر کرنے میں مسائل واختلافات کم تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے دین میں بھی ہدایات واحکامات اسی درجہ پر ہوتے تھے کہ وہ اس دور کی انسانیت کی پوری طرح ہدایت کر دے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شرع لکم من الدین ماوصی بہ نوحاً الخ (۴۲/۱۳) تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا نوحؑ کو حکم دیا گیا تھا۔ حضورﷺ کو جو دین دیا گیا تھا وہ کوئی نیا نہیں تھا بلکہ وہی تھا جو گذشتہ انبیاء کرام کو دیا گیا تھا۔ البتہ چونکہ اس دین کو حضورﷺ پر ختم ہونا تھا اس لئے اس کو اسی درجہ جامع اور انسانیت کے لئے خود مکتفی بنایا گیا کہ یہ ہر دور کی انسانیت کی راہنمائی کے لئے کافی ہو جائے۔ حضورﷺ کو آیۂ کریمہ (۶/۹۰) میں سابقہ متعدد انبیاء کرام کے نام لے کر حکم دیا گیا ہے کہ اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ (۶/۹۰)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں ہم نے ہدایت دی تھی۔ اے پیغمبر آپ ان کی ہدایت کی پیروی کیجئے۔ اس آیت میں سابقہ انبیاء کرام کی ہدایت کی پیروی کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ ان سابقہ انبیاء کرام میں سے کسی کی بھی کوئی حدیث یا روایت حضورﷺ کے پاس موجود نہیں تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اقتداء و پیروی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یہ پیروی ان کی ذاتی، شخصی پیروی نہیں تھی بلکہ ان کے اقتداء کرنے کا واحد ذریعہ یہی تھا کہ ان کے دین کی اقتداء کی جائے۔ جو انہوں نے وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ حضورﷺ کے دور کی وحی قرآن میں تھی۔ اس لئے قرآن کے قائم کردہ دین کا اتباع ان انبیاء کرام کی اتباع واقتداء تھی اور ہمارے لئے بھی قرآن کے دین کا اتباع حضورﷺ کا اتباع ہے۔ قرآنِ کریم کا مقصد ذاتی یا شخصی معمولات کا اتباع نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد ہمیشہ، اس کے دین کا اتباع ہوتا ہے۔ اور یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

حضرت موسیٰؑ کا معاملہ جب دربار فرعون میں پیش ہوا اور فرعون نے اس بات پر اظہار رضامندی کر دیا کہ انہیں قتل کر دیا جائے تو انہیں میں ایک مرد مومن بھی تھا جس نے اس وقت کے مصالح کی بناء پر اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا کیونکہ اسے خیال تھا کہ ایمان کے برملا اظہار کرنے سے وہ حضرت موسیٰؑ کی زیادہ مدد نہیں کر سکے گا لیکن جب اسے خیال ہوا کہ ایمان کے اظہار کا وقت آ گیا ہے تو اس نے اس بھرے دربار میں جس میں فرعون جیسا جابر حاکم موجود تھا اپنے ایمان کا اظہار کر دیا۔ اس کی تقریر اس درجہ معرکہ انگیز اور ایمان افروز تھی کہ قرآن کریم نے اس کو محفوظ کر کے' حیات جاوید عطا کر دی۔ اس نے کہا کہ تم ایسے شخص کو قتل کر رہے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ اس کے بعد اس نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے ہوتے ہوئے کہا یقومِ اتبعون اھدکم سبیل الرشاد (۴۰/۳۸)' بھائیو میرا اتباع کرو میں تمہیں ہدایت کا راستہ دکھا دوں گا۔ مومنِ آلِ فرعون نے حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ دونوں کی موجودگی میں اپنے اتباع کی دعوت دی۔ اس سے اس مومن کا مقصد ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ اس کی ذاتی پیروی کی جائے بلکہ مقصد وہی تھا کہ وحی کی اطاعت کی جائے' جس کی پیروی حضرت موسیٰؑ' حضرت ہارونؑ اور وہ مرد مومن خود کر رہا تھا۔

حضورﷺ نے اپنی اور صحابۂ کرامؓ کی شب و روز کی محنت شاقہ کے بعد مدینہ شریف میں دین خداوندی قائم کر دیا' جس کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ چونکہ حضورﷺ خود موجود تھے' جو اس دین کے سربراہ کی حیثیت رکھتے تھے' اس لئے ان کی اطاعت دین کی اطاعت تھی' اس میں کسی مسلمان کو مجال انکار نہیں ہے۔ یہ نظام وقتی یا ہنگامی نہیں تھا۔ اس کو ہمیشہ کے لئے رہنا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ نظام منقرض و منقطع ہو گیا۔ نظام کے منقرض ہونے کے بعد اہم ترین سوال یہ ہے کہ اب اس نظام یا دین کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اس میں دو مختلف موقف ہیں جن کی وضاحت اس مضمون میں کی جائے گی قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اس کو توجہ سے غور فرمائیں کہ یہ نکتہ بہت غور کا متقاضی ہے۔

ہمارے علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ اب اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم قرآن و روایات کا اتباع کریں تو ہم اللہ و رسول کی اطاعت کر لیں گے۔ جہاں کہیں بھی اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے الفاظ آتے ہیں ان کے نزدیک عملاً اس کا مفہوم قرآن اور کتب روایات کی اطاعت ہوتا ہے لیکن ہمارے خیال میں علماء کرام کا یہ موقف قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے' جس کے لئے تین اعتراضات سامنے آتے

ہیں۔

(۱) قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کا ذکر آتا ہے' ان دو مطاعوں کے لئے ہمیشہ واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو اطاعتیں نہیں ہیں بلکہ دو مطاع ہونے کے باوجود اطاعت یہ ایک ہی ہے۔ اس بات کے ثبوت کے لئے سابقہ مضامین میں ہمیشہ آیات درج کی گئی ہیں۔ جو قارئین کرام کئی مرتبہ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ان کو بار بار تحریر کرنے سے مضمون کو طوالت ہوتی ہے' اور قارئین کرام کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے۔ ان آیات کریمات کے حوالے دیئے جاتے ہیں قارئین کرام خود ملاحظہ فرمالیں۔

(۲۴/۶۳' ۴۔۱/۵۹' ۸/۴۸' ۸/۱۰۷' ۹/۱۳' ۸/۵' ۵۸/۲۰' ۵۸/۳۶' ۳۳/۸' ۵۹/۵۴' ۲۴/۲۴' ۹/۲۴' وغیرہ) اس کے علاوہ

(۲) قرآن کریم نے اطاعت سے پہلے سماعت لازمی قرار دی ہے۔ قرآن و روایات پر علیحدہ علیحدہ عمل کرنے سے سماعت کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ اطاعت کے لئے سماعت شرط ہے۔ اس کے لئے آیات پہلے بھی تحریر کی گئی ہیں۔ اب صرف حوالہ جات دیئے جاتے ہیں۔ (۲/۲۸۵' ۲۰/۸' ۲۴/۵' ۶۴/۱۶)۔

(۳) اس سماعت کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔

جہاں تک حدیث کی اطاعت کا سوال ہے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ عرض ہے کہ ہم حدیث و روایات میں فرق نہیں کرتے۔ حضورﷺ کے اپنے دہن مبارک سے ارشاد کردہ فرمودات حدیث تھے۔ جو ان کے مخاطبین سنتے تھے ہم جن کو حدیث کہتے ہیں۔ یہ روایات ہیں جو کہ کئی کئی واسطوں سے ہمارے تک آئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام خود اس ذخیرۂ روایات کو مشکوک اور ظنی خیال کرتے ہیں۔ وہ ہر روایات کے شروع میں **قال رسول اللہ** اور آخر میں **اوکمال قال رسول اللہ** کہتے ہیں جس کے معنے ہیں کہ حضورﷺ نے فرمایا' یا جس طرح بھی حضورﷺ نے فرمایا' اس طرح وہ خود سارے ذخیرۂ روایات کو بالکل مشکوک وظنی قرار دے دیتے ہیں جبکہ تمام قانون دان حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قانون کا بالفظ منقول ہونا ضروری ہے۔ قانون میں تو ایک ایک لفظ اور بعض اوقات ایک ایک حرف کی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ روایات قانون بننے کے معیار پر ہی نہیں اترتیں' اس لئے ان کی اطاعت سے کسی کی بھی اطاعت نہیں ہوتی۔ اگر آپ بہت زیادہ خوش عقیدگی میں مبتلا ہیں تو ان کی اطاعت سے محدثین کی اطاعت کرنا خیال فرما سکتے ہیں۔

علماء کرام کا موقف آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اللہ و

رسول کی اطاعت کے بارے میں دوسرا موقف تحریکِ طلوع اسلام اور علماء قرآن کا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ارشاد ہوتا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اللہ کی اطاعت رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ حضورﷺ کی اپنی حیات مبارکہ کے دوران تو اس معاملہ میں کوئی مشکل نہیں تھی جو کچھ حضورﷺ فرماتے اس کی فوری تعمیل ہو جاتی تھی' اس وقت جو مسئلہ غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ حضورﷺ کے بعد' حضورﷺ کی اطاعت کیسے کی جائے۔ ہمارے علماء کرام تو حضورﷺ کی وفات کے بعد روایات کو حضورﷺ کا قائم مقام بناتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی مشہور ترین تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں مرقوم ہے: ''ظاہر ہے کہ حضورﷺ کی وفات کے بعد آپ کی سنت ہی ہے جو آپ کے قائم مقام ہوسکتی ہے۔'' جلد دوم صفحہ ۳۲۶' اسی طرح تفسیر مظہری میں ارشاد ہوتا ہے ''اور رسول کی طرف پھیر دو جب تک رسول زندہ ہیں اور وفات کے بعد ان کی سنت کی جانب رجوع کرو'' تفسیر مظہری جلد سوئم صفحہ ۹۶' لیکن ہمارے خیال میں یہ بات قرآن کریم کے مطابق نہیں ہے۔ حضورﷺ کی وفات کے بعد' حضورﷺ کی قائم مقام روایات نہیں ہوسکتیں بلکہ حضورﷺ کا قائم مقام ان کا خلیفہ یا جو ان کا جانشین ہوتا ہے وہ حضورﷺ کا قائم مقام بن جاتا ہے اور اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق حضورﷺ کے بعد' روایات کے بجائے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اطاعت' اللہ و رسول کی اطاعت تھی' ان کے بعد' حضرت عمرؓ۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی اطاعت اسی درجہ و منزلت پر تھی۔ اگر وہ نظام قائم رہتا تو آج تک اسلامی سربراہ مملکت کی اطاعت ہی اللہ و رسول کی اطاعت قرار پاتی۔ اسی لئے حضورﷺ نے فرمایا تھا کہ علیکم بسنتی و سنت الخلفاء الراشدین المھدین۔ تم پر میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت ضروری ہے۔ قرآنی نظام قائم کرتے' قرآنی نظام کے فیصلے' اس حکومت کے انتظامات کرنے کے اقدامات' یہ سب سنت رسول اللہ تھے اور ان کے خلفاء کے فیصلے بھی سنت تھے۔ اگر حضورﷺ کے زمانے کے فیصلوں کو ہمیشہ علیٰ حالہٖ رہنا مقصود ہوتا اور ان کی اطاعت روایات کے ذریعے کرنا ہوتی تو اس حدیث میں ''خلفائے راشدین مھدین کی سنت'' کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا یہ واضح رہے کہ یہ خلفائے راشدین کسی خاص زمانے تک محدود نہیں تھے۔ اگر خلافت راشدہ مسلسل قائم رہتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانے سے لے کر آج تک کے خلفاء' خلفاء راشدین ہی قرار پاتے۔ اور اگر اب کبھی بھی مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی اور پھر وہ سلسلہ قائم

ہو گیا تو ان نئے خلفاء راشدین کے حکومت چلانے کے اقدامات اوران کے فیصلے سنت کہلائیں گے اوران کی سنت کی اطاعت واجب ہوگی اوراس دور کے مسلمانوں کوان کی سنت کی اطاعت کرنی ہوگی۔

اس نکتہ کی مزید وضاحت کے لئے کہ حضورﷺ کی وفات کے بعد آپ کی قائم مقام کتب روایات نہیں ہو جاتیں بلکہ آپ کے خلفاء آپ کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) حضورﷺ نے فرمایاو من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصانی فقد عصی اللہ و من عصی امیری فقد عصانی (بخاری ومسلم شریف) جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ حاکم کی اطاعت کی اس نے دراصل میری اطاعت کی اوراسی طرح میرے امیر کی نافرمانی میری نافرمانی ہےاور میری نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

(۲) و من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاہلیۃ۔ (مسلم شریف) جوشخص ایسی حالت میں مر جائے کہ اس کی گردن میں کسی امیر کی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(۳) انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ و یتقی بہ فان امر بتقویٰ اللہ و عدل فان لہ بذالک اجراء وان قال بغیرہ فان علیہ منہ (مشکوٰۃ شریف)۔بے شک امام وہ سپر ہے جس کے پیچھے ہوکر جنگ کی جاتی ہے اوراس کے ذریعے سے حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔بس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اسے ثواب ملے گا اوراس کے خلاف کرے تو گناہ گار ہوگا۔

قرآن کریم کا قائم کردہ نظام ہنگامی یا وقتی نہیں تھا۔یہ ایک ابدی ضابطۂ حیات ہے۔اس میں بہت مقامات ایسے ہیں جن میں النبی یا الرسول مخاطب کر کے بہت سے احکامات جاری کئے گئے ہیں۔ان الفاظ کا اطلاق حضورﷺ کے عہد میں خود حضورﷺ پر ہوتا تھا لیکن آپ کی وفات کے بعدان احکامات کامقصود ومنطوق آپ کے جانشین اورآپ کے خلفاء ہیں۔آپ مندرجہ ذیل آیات کریمات پر غور فرمائیں۔یہ وہ احکامات ہیں جوحضورﷺ کے بعد ختم نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ آپ کے خلفاء و جانشینوں کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے۔جب تک بھی ان خلفاء راشدین کا سلسلہ قائم رہے گا اگر آپ ان احکامات کوآئندہ کے خلفاء کی طرف منتقل نہ کرتے رہیں تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کے نزدیک وہ احکامات صرف حضورﷺ کے دور تک کے

لئے تھے۔ لیکن اگر یہ صورت تھی تو اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان احکامات کی ابدیت کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت ہیں۔ مضمون کی طوالت سے بچنے کے لئے آیات کا صرف ترجمہ مع حوالہ جات تحریر ہے۔ آیات آپ خود قرآن کریم سے ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) (اے رسول) جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو اگر وہ تیرے پاس آتے' پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے بخشش مانگتا تو اللہ کو تواب و رحیم پاتے (۴/۶۴)۔

قرآنِ کریم کے حکم کے مطابق حضورﷺ کی زندگی میں تو یہی ضروری تھا کہ مومنین حضورﷺ کے پاس آ کر متعلقہ معاملہ کی صفائی حضورﷺ کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت بھی حکام کی مخالفت کرنے والوں کو حضورﷺ کے مزار پر حاضر ہونا اور خود حضورﷺ کے ساتھ بالمشافہ صفائی کرانا' اور حضورﷺ سے بخشش منگوانا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت تو اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت اس کی عملی شکل یہی ہے کہ اسلامی حکومت کے موجودہ دور کے حکام کے پاس جا کر ہی صفائی کرائی جائے اور حکام کو بھی لازم ہے کہ وہ ہمارے لئے اللہ سے بخشش طلب کرتے ہوئے' اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ پس اس آیہ کریمہ اور اس قسم کی تمام آیات میں رسول سے مراد رسول اور ان کے خلفاء ہیں۔

(۲) اور جب ان کے پاس کوئی بات امن یا خوف کی آتی ہے.....الخ (۴/۸۳)۔

اس آیۂ کریمہ کے حکم کے مطابق کیا ہمیں اس وقت افواہوں کو حضورﷺ کے سامنے لے جانا اور ان کے متعلق حضورﷺ سے استنباط کرانا ممکن ہو سکتا ہے اور کیا حضورﷺ اس وقت ہماری موجودہ افواہوں کو سن کر ان سے کوئی استنباط کر کے ہمیں بتا سکتے ہیں کہ کون سی خبر صحیح ہے اور کونسی غلط ہے' لازماً و یقیناً یہاں رسول اللہ سے مراد رسول اور ان کے بعد ان کے خلفاء ہیں۔

(۳) تم ان سے درگذر کرو اور ان کے لئے مغفرت کی دعا مانگو اور ان سے مشورہ کیا کرو (۳/۵۹)۔

اس آیۂ کریمہ میں رسول اللہ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب ان کی جگہ دوسرے حکام مشورہ کریں گے۔

(۴) مدینہ کے رہنے والوں اور ان کے گرد و نواح کے دیہاتیوں کو یہ جائز نہ تھا کہ رسول خدا کا ساتھ چھوڑ دیں اور نہ یہ جائز تھا کہ رسول کی جان سے بے پروا ہو کر اپنی جانوں کی فکر کریں (۹/۱۲۰)۔

آیۂ کریمہ سے واضح ہے کہ یہ امت صرف رسول

اللہ کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی اور نہ ہی یہ حکم صرف اہل مدینہ اور ان کے اردگرد کے اعراب کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بلکہ اس حکم کا اطلاق بعد کے خلفاء پر اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ خود اس کا اطلاق حضورﷺ پر تھا۔ اس آیت کریمہ سے پہلی آیت میں مومنوں کو حکم دیا گیا تھا کہ صادقین کا ساتھ دیتے رہو اور اس آیت کے بعد جو اس حکم کی دلیل ہے وہ بھی بطور اصول اور ابدی حقیقت کے بیان کی گئی ہے۔ پس ایسی آیات میں حضورﷺ کے بعد ان کے خلفاء ہی مراد ہوتے ہیں۔

(۵) جو کچھ خدا نے اور اس کے رسول نے ان کو عطا کیا تھا اگر یہ لوگ اس پر راضی رہتے اور کہتے کہ خدا ہمارے لئے کافی ہے (اِس وقت نہیں تو) عنقریب یہی خدا ہمیں اپنے فضل وکرم سے اور اس کا رسول دے گا ہم تو یقیناً اللہ کی طرف لَو لگائے بیٹھے ہیں (۹/۵۹)۔

اس آیت سے واضح ہے کہ صدقہ نہ ملنے والوں کو بجائے برا ماننے اور اعتراض کرنے کے قرآن کریم کے بیان کردہ الفاظ کہنے چاہئیں تھے۔ اس وقت بھی حکومت کے افسران کو غریب لوگوں کی مدد کرنے کے لئے صدقات تقسیم کرنے ضروری ہیں۔ تو کیا اس وقت مذکورہ بالا حکم کے مطابق لوگوں کو یہ کہنا چاہئے کہ خود رسول اللہ ہمیں صدقات دینے آئیں گے، ہرگز نہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اللہ اور ہمارے موجودہ حاکم ہمیں دیں گے ہم اللہ کی طرف راغب ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ان خدمات کو ادا کرنے کے لئے جو رسول اللہﷺ سے دوسرے حکام کی طرف منتقل ہوسکتی ہیں رسول اللہ کے موجود نہ ہونے کے وقت ان کے خلفاء مراد ہوتے ہیں۔

(۶) اے مسلمانو آپس میں رسول کو ایسے نہ پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو (۲۴/۶۳)۔

یہ حکم حضورﷺ کی وفات کے بعد ختم نہیں ہو گیا۔ حضورﷺ کے بعد آپ کے خلفاء اسلامی حکومت کے اعلیٰ افسران، سربراہِ مملکت، سب کا ایسا ہی ادب و احترام ضروری ہے۔

(۷) جب اے پیغمبر آپ ان میں موجود ہوں تو آپ انہیں نماز پڑھائیں (۴/۱۰۲)۔

تمام فقہاء اور مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضورﷺ کے بعد یہ حکم آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور اسی طریقہ سے حضورﷺ کی زندگی میں اس کے مخاطب آپ تھے، اور آپ کی وفات کے بعد جو آپ کا خلیفہ ہو، وہ اس کا مخاطب ہوگا۔

(۸) سچے ایمان دار تو صرف وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب کسی ایسے کام کے

لئے جس میں لوگوں کے جمع ہونے کی ضرورت ہے رسول کے پاس جمع ہوتے ہیں' تو جب تک اس سے اجازت نہ لے لیں' جاتے نہیں (۲۴/۶۲)۔

اب بھی امر جامع کے لئے یہی حکم ہے کہ کسی ایسی میٹنگ میں جس میں آپ کی موجودگی ضروری ہے۔ میٹنگ کے منتظم سے اجازت لئے بغیر آپ کا جانا مناسب نہیں ہے کیونکہ میٹنگ سے بغیر اجازت لئے چلا آنا' Decorum کے خلاف ہے۔ ایسی تمام آیات میں رسول سے مراد خود حضورﷺ اور آپ کے بعد' آپ کے خلفاء ہیں۔

(۹) تم کیونکر کافر بن جاؤ گے حالانکہ تمہارے سامنے خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور اس کا رسول بھی تم میں موجود ہے۔

یہاں ''**فیکم رسولہ**'' اور اس کا رسول تم میں ہے کے معنے حضورﷺ کی موجودگی میں خود حضورﷺ ہیں اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء ہیں لیکن ہمارے علماء کرام ''**فیکم رسولہ**'' سے مراد ''**فیکم احادیث رسول اللہ**'' لیتے ہیں' جو بداہتاً غلط ہے۔

یہ دس آیاتِ کریمات اور چند احادیث نبویہ یہ ثابت کرنے کے لئے تحریر کی گئی ہیں کہ آپ کی اطاعت آپ کی حیات طیبہ میں لازمی تھی اور آپ کی یہ اطاعت آپ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ آپ کی اطاعت ایک زندہ اتھارٹی کی اطاعت کی معرفت ہوتی ہے۔ کتب روایات کے ذریعے آپ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے ہاں چونکہ تفاسیر ضابطۂ تحریر میں اس وقت آئیں جب اسلام مذہب کی صورت اختیار کر چکا تھا اس لئے وہ آیات کریمات جن کا خاص تعلق خالص دین سے ہے' ان کی تفسیر ہر مفسر نے مذہب کی سطح پر ہی کی ہے اور وہ اس کے لئے اس لئے مجبور تھے کہ ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ تمام تفاسیر ڈیڑھ ہزار سال سے اسی طرح تحریر کی گئی ہیں۔ ہمارا یہ دور اس معاملہ میں بڑا خوش قسمت ہے کہ زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسلمانوں کے سامنے پھر دین کا تصور واضح ہو رہا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تحریک طلوع اسلام کو اس کی اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ جن آیات کا تعلق خاص دینی نظام سے ہے ان آیات کی تشریح ازسرِنو دین کے معیار پر کی جائے۔ اس بارے میں سورہ النساء کی آیت انسٹھ (۵۹) بہت اہمیت کی حامل ہے اس آیہ کریمہ سے متعلق جس قدر مواد تحریر کیا گیا ہے' وہ سب کا سب قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ مواد آیت کا صحیح مفہوم سامنے آنے ہی نہیں دیتا۔ جس قدر اس آیہ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے' اسی قدر یہ ان تشریحات سے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی

چلی گئی ہے۔آپ کے سامنے اس کی مذہبی تفسیر یقیناً ہوگی۔ اب آپ اس آیہ کریمہ کی تفسیر دین کے معیار پر ملاحظہ فرمائیں۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عز اِسمہٗ ہوتا ہے۔

یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان..... الخ (۴/۵۹)۔

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اولی الامر کی پس اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اس کو اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ طریقہ بہتر اور باعتبار مآل اچھا ہے۔

آیہ کریمہ نے یہ بات واضح کر دی کہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اپنے اختلافات کا فیصلہ اللہ و رسول اور اولی الامر سے کرایا جائے۔ان کے علاوہ دنیا کی کسی اور اتھارٹی کو اس کا کوئی حق نہیں کہ ان سے فیصلہ کرایا جائے۔دوسری بات یہ پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ یہ آیت کریمہ تنازعات کے فیصلے کرانے کی صورتیں پیش کر رہی ہے۔اگر کسی بات میں عوام کا کوئی تنازعہ نہیں ہے اور وہ قرآنی حکومت کے احکامات کی اطاعت کر رہے ہیں تو اس صورت میں از خود اللہ و رسول کی اطاعت ہو رہی ہے اور یہ اطاعت بمنزلہ عبادتِ خداوندی کے ہے اور اس اطاعت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ صرف اعلیٰ حکام کی اطاعت ہی اطاعت خداوندی شمار کی جائے بلکہ اس حکومت کی پوری Heirarchy کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ایک سپاہی کی اطاعت، اسلامی حکومت کی سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت کی طرح ہے کیونکہ وہ سپاہی اپنی اطاعت نہیں کرا رہا ہے بلکہ وہ حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے حکومت کی اطاعت کرا رہا ہے۔البتہ تنازعات کی صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

(۱) ایک صورت تو یہ ہے کہ آپس میں عوام کا تنازعہ ہے کہ ایک مخصوص پلاٹ پر بچوں کے لئے Play Ground بنا دیا جائے، لیکن کچھ لوگوں کا اصرار ہے کہ نہیں یہ میدان بہت قیمتی ہے اور بہت اچھی جگہ شہر کے وسط میں واقع ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ایک اچھا کالج بنا دیا جائے۔دونوں خیال کے لوگوں کا آپس میں شدید اختلاف ہوا۔لیکن کچھ عرصہ بعد چند صاحب الرائے حضرات نے مل کر آپس میں فیصلہ کر لیا اور باہمی تنازعہ کی صورت باقی نہیں رہی۔اس صورت میں گورنمنٹ Involve ہی نہیں ہوئی اور اللہ و رسول کی اطاعت معمول کے مطابق ہوتی رہی۔

(۲) لیکن اگر دونوں فریقین کا فیصلہ نہیں ہوا تو وہ دونوں فریق ڈپٹی کمشنر سے رجوع کریں گے اور D.C ان

دونوں پارٹیوں کے مابین فیصلہ کر دے گا اب دونوں فریقوں پر D.C کا حکم ماننا ضروری ہوگا اور یہ اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی۔ (اگر کوئی فریق D.C کا حکم نہیں مانتا تو یہ اللہ ورسول کی معصیت ہوگی)۔

(۳) لیکن اگر ایک پارٹی اب بھی D.C کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو یہ کیس صوبے کے گورنر کو پیش کیا جائے گا۔ اس میں بھی وہی صورت ہوگی کہ اگر دونوں فریقین نے گورنر کے فیصلے کو مان لیا' اور تنازعہ ختم ہوگیا' تو دونوں نے اللہ ورسول کی اطاعت کر لی اور معاملہ یہاں ختم ہوگیا۔ لیکن اگر اب بھی ایک فریق مطمئن نہیں ہے اور گورنر کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کیس کی آخری اپیل سنٹر میں ہوگی اور اس کیس کو سنٹر کی طرف Refer کر دیا جائے گا۔ (قرآنی حکومت کے) مرکز یا سنٹرل اتھارٹی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کی تعمیل سے انحراف نہیں کیا جا سکتا اس فیصلہ کی تعمیل کرنا دونوں فریقوں پر ضروری ہوگا۔ اور اس فیصلہ کو تسلیم کرنا' اللہ ورسول کی اطاعت ہوگا۔

(۴) ایک صورت اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ خود اولی الامر کے مابین آپس میں اختلاف ہو جائے۔ مثلاً ایجوکیشن منسٹری ایک خاص بجٹ چاہتی ہے کہ جس کے ذریعے وہ پروفیسروں اور اساتذہ کی تنخواہوں میں خاطر خواہ اضافہ کرنا چاہتی ہے تاکہ معیارِ تعلیم بلند ہو۔ لیکن فنانس منسٹری اپنے ہاں اس رقم کی گنجائش نہیں دیکھتی۔ دونوں وزارتوں کے افسران نے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کی کہ دونوں وزارتوں کے وزراء میٹنگ کر کے اس مسئلہ کا کوئی حل نکال لیں' چنانچہ ان دونوں وزراء نے آپس میں مل کر' اس مسئلہ کا حل نکال لیا اور تنازعہ کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں اللہ ورسول کی اطاعت ازخود ہوتی رہی ہے۔ لیکن یہ بھی امکان ہے کہ دونوں وزراء میں بھی اختلاف قائم رہے اور مسئلہ کسی طرح طے نہ ہو پائے تو وہ دونوں وزراء اس مسئلہ کو سنٹرل اتھارٹی' وزیراعلیٰ یا اس کی Cabinet کی طرف Refer کر دیں گے۔ اس اتھارٹی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت اور اس کی نافرمانی معصیت خداوندی ہوگی۔

یہ تنازعات محض مثال کے طور تحریر کئے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس حکومت کا ڈھانچہ بالکل مختلف ہو' وہاں اولی الامر کی کوئی اور Definition ہوگی۔ اس میں گورنر ہو یا نہ ہو۔ سپریم کورٹ کا بھی اس میں دخل کسی نہ کسی Stage پر ہونا ضروری ہے۔ تنازعات اور ان کو حل کرنے کی صورتیں صرف بات سمجھانے کے لئے تحریر کی گئی ہیں۔ جو بات گوش گذار کرنی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ قرآنی حکومت میں مرکزِ ملت یا امیر یا سنٹرل اتھارٹی کی اطاعت ایک طرح سے عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔

اب آپ اس آیت کی تفسیر مذہب کی رو سے ملاحظہ فرمائیں۔ جب دونوں فریقوں میں ایک پلاٹ کے بارے میں تنازع واقع ہو اور دونوں فریقین موقع پر جائیں اور بخاری شریف اور مسلم شریف بھی ساتھ لے جائیں' کہ اس مسئلہ کا حل کتب روایات کی رو سے تلاش کیا جائے۔ تو معاف بفرمائیے' یہ کتبِ روایات باجود اپنے احترام واکرام کے دونوں فریقوں کا کوئی فیصلہ نہیں کرا سکیں گی اور اگر بالفرض ان کتابوں نے کوئی فیصلہ دے بھی دیا تو وہ اس درجہ Controvercial ہوگا کہ دونوں فریق ساری عمر ایک دوسرے کا سر پھوڑتے رہیں گے' اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے۔ اسی طرح مختلف وزارتوں کے تنازعات کے فیصلے بھی کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکیں گے۔ ان کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔

قرآن کریم نے تنازع دور کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے اس کے لئے فرمایا کہ ذلک خیر و احسن تاویلا (۴/۵۹)۔ فیصلہ کرانے کا یہ بہترین طریقہ ہے لیکن آپ خیال فرمائیں کہ ہم مسلمان ڈیڑھ ہزار سال سے اپنے تنازعات کے فیصلے کتبِ روایات سے کراتے چلے آرہے ہیں۔ آپ صدق دل سے فرمائیں کہ اس طویل عرصہ میں کسی بھی تنازع کا قابل اطمینان فیصلہ ہوا ہے۔ کتابوں سے دوٹوک اور واضح فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ جب فیصلہ کرانے کا طریقہ ہی غلط ہے تو اس سے صحیح فیصلہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اولی الامر کو تو زندہ اتھارٹی خیال فرماتے ہیں لیکن اللہ و رسول سے مراد کتبِ روایات لے لیتے ہیں جو نہ تو خود زندہ ہیں' اور نہ ہی کسی قسم کا فیصلہ کرسکتی ہیں۔ فیصلے کرانے والی اتھارٹی کے لئے ناطق ہونا ضروری ہے۔ اتھارٹی صامت ہو ہی نہیں سکتی۔

اس بات میں تو ہمارا اور علمائے کرام کا اتفاق ہے کہ اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ رسول اللہ کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (۴/۸۰)۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس میں دو مختلف رائے نہیں ہوسکتی۔ البتہ فیصلہ کن مسئلہ اور صرف ایک ہے اور وہ جب تک حل نہیں ہو گا مسلمان کبھی قعرِ مذلت سے باہر نہیں نکل سکتے اور وہ یہ ہے کہ حضورﷺ کی وفات کے بعد حضورﷺ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ تحریک طلوع اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حضورﷺ کے بعد آپ کے جانشین کی اطاعت ہی رسول کی اطاعت ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ خلفاء راشدین کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضورﷺ کی حدیث علیکم بسنتی و

سنۃ الخلفاء الراشدین المہدین (مشکٰوۃ شریف) تم پر میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس حدیث شریف میں خلفاء راشدین کی سنت کا اضافہ اسی بات کی دلالت کرتا ہے۔ واضح رہے کہ خلفاء راشدین کی کوئی مقررہ تعداد نہیں ہے۔ جب تک وہ نظام جاری رہتا اس نظام کا سربراہ خلیفۂ راشد ہوتا۔ اگر اس نظام کی شکل نہ ٹوٹتی تو آج بھی اس نظام کا سربراہ خلیفہ راشد ہوتا۔ اس کے برخلاف ہمارے علماء کرام کا نظریہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے انتقال کے بعد، آپ کی اطاعت کتب رویات کے ذریعے ہوتی ہے اور حضورﷺ کی قائم مقام روایات ہو جاتی ہیں۔ ان کے نزدیک اب رسول کی اطاعت کی عملی شکل روایات کی کتابوں کی اطاعت ہے جبکہ تحریکِ طلوع اسلام کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت کی عملی شکل خلیفۃ الرسول کی اطاعت ہے۔

صرف اس ایک نکتہ کے فرق سے دین و مذہب کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس مضمون میں یہی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے حضورﷺ کے بعد ان کا جانشین ہونا ضروری ہے تاکہ اللہ و رسول کی اطاعت کی جا سکے اور اس کے لئے شروع مضمون میں دس آیات قرآنیہ اور چند احادیث نبویہ پیش کر دی گئی تھیں۔ اب اس نکتہ کا فیصلہ کرنا آپ کی صوابدید پر چھوڑا جاتا ہے۔

فستذکرون ما اقول لکم وافوض امری الی اللہ (۴۰/۴۴)۔

جو میں تم سے کہتا ہوں تم عنقریب اسے یاد کرو گے، اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

مذہبی عذاب کی مختلف شکلیں

معزز قارئین! سب سے پہلے مخصوص مذہبی ملمع سازی ملاحظہ کیجئے۔ قرآن کریم میں مذھب کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن اس کتابِ عظیم میں **ذھب** آیا ہے جس کے ایک معنی ہیں ''لے جانا'' (Annul) زائل کرنا مثلاً ذھب اللہ بنورھم (۲/۱۷) اللہ ان کے نور کو لے گیا یعنی اللہ کے قانون مکافات نے ان کا نور زائل کر دیا۔ لفظ **ذھب** کے ساتھ حرف ذ سے پہلے جب مجدد، محدث، مفتی، مولانا، ملاّ، مولوی اور مرشد و مرید والی م لگا دی گئی تو یہ ''پھر'' (again) دین کو لے جانے والا۔ دین کو annul کرنے والا۔ دین کو زائل کرنے والا ''مذھب'' بن گیا جسے مٹانے کے لئے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو دین حق دے کر بھیجا تھا (۹/۳۳) نیز سونے کا ملمع کی گئی شے (Gold plated) کو مذہب کہا جاتا ہے۔ دین اسلام کے صدر اول میں مندرجہ بالا القاب (appellations) کا نام و نشان تک باقی نہیں تھا ''یہ سب بعد کی صنعت گری ہے۔ ان ملمع سازوں کے متعلق قرآن میں ہے واللہ یعلم ما تصنعون (اللہ تمہاری ٹیکنیک کو خوب جانتا ہے (۲۹/۴۵)۔ ان اللہ علیم بما یصنعون (۳۵/۸) بے شک اللہ ان کے ساختہ پرداختہ سے واقف ہے۔

مذھب کے دوسرے عام معانی ہیں کسی شخص کا وضع کردہ راستہ، طریقہ، وہ عقیدہ جس کی طرف کسی کا رجحان ہو۔ جس طرح ہم امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔ اس سے دین ''(یعنی وہ دستورِ حیات جو خدا کی طرف سے ملا تھا)'' گم ہو گیا۔ (محترم اقبالؒ نے اس حقیقت کو ایک شعر میں یوں سمو دیا کہ ؎ نماز و روزہ و قربانی و حج۔ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے۔ مطلب ستون بطور یادگار تو ہیں لیکن اب ان کے اوپر دین کی چھت نہیں ہے جس سے حفاظت اور امن و سلامتی حاصل ہو۔ اور اسی طرح مسلمانوں میں دیگر مختلف شخصیتوں کی طرف منسوب کردہ مذاہب بھی آگے چل پڑے۔ عوام میں جو ذرا زیادہ سمجھدار لوگ تھے انہوں نے ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے آپ کو خدا کے مقرب یا نمائندے بنا کر خود ساختہ رسوم و قوانین منوانے شروع کر دیئے۔ اس طرح مذہبی پیشوائیت اور روحانی اقتدار کے ادارے وجود میں آ گئے۔ حکمران

طبقہ نے ان ''خدائی نمائندگان'' سے گٹھ جوڑ پیدا کیا تو انہوں نے انہیں ''ظل اللہ علی الارض'' اور خدائی اختیار کا حامل قرار دے کر عوام کو ان کے حضور جھکنا سکھایا۔ ابتدائے اسلام میں صرف دین تھا جو ضد ہے مختلف نظامہائے حیات' ملوکیت' آمریت' جاگیرداری' نظام سرمایہ داری' نظام جمہوریت' سوشل ازم' کیمونزم' سیکولرازم وغیرہ کی۔ جب دین کی جگہ مذہب نے لے لی تو وہ بھی دنیا کے دیگر مذاہب' یہودیت' عیسائیت' ہندومت اور بدھ مت کی طرح ایک عقیدہ بن گیا۔ بش' بلیئر اور دیگر مغربی لیڈر مسلم ممالک میں اپنا سرمایہ دارانہ نظام جمہوریت بچھانے کی زبردست اور سرتوڑ کوشش میں لگے ہوئے ہیں تاکہ مستقبل میں بھی ان میں سے کسی ایک ملک میں خلافت علیٰ منہاج رسالت مآب ﷺ یعنی قرآنی نظام دوبارہ قائم نہ ہونے پائے۔ ان کے مقابل ہمارے مذہبی و سیاسی لیڈر اور دانشور بین المذاھب ہم آہنگی کی باتیں کرتے نہیں تھکتے یہ اس لئے کہ مذہب عقل کو بھی لے جانے والی شے ہے یہی علمائے کرام کا فرمان ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں۔ انگریزی زبان میں مذہب کا ترجمہ Religion کیا گیا جس کے ایک معنی Sect (فرقہ) ہیں۔ فرقے مذاہب میں ہوتے ہیں دین میں فرقے نہیں ہوتے نہ ہی پارٹیاں۔ لفظ دین کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان کے ایک لفظ میں نہیں ہوسکتا کیونکہ دین کے معانی ہیں غلبہ' اقتدار' حکومت' مملکت' آئین' قانون' نظم و نسق' فیصلہ' ٹھوس نتائج' جزا و سزا اور دوسری طرف اجتماعی نظام زندگی میں یہ اطاعت اور فرماں پذیری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اسے مذہب یا Religion نہیں کہنا چاہئے۔ دین ہی کہنا چاہئے۔

تمام انبیاء علیہم السلام سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ خدا کے تجویز کردہ دین کو عملاً قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ ہونے دیں کیونکہ نظامِ خداوندی سے مقصود یہ ہے کہ نوع انسانی اپنے اختلافات اور تفرقات کو مٹا کر ایک عالمگیر برادری بن جائے۔ مذہب میں فرقے اور پارٹیاں باہمی ضد' تعصب' بغض' عداوت' ہٹ دھرمی' معاشی مفاد پرستی اور نان ایشو کی بحث میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کے جذبہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے اور پارٹی بازی خدا کا عذاب۔ فرقوں میں بٹی ہوئی قوم کا رسول کریم ﷺ سے کوئی واسطہ نہیں رہتا (۶/۱۶۰)۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ شیعہ تھے نہ سنی اور نہ دیوبندی یا بریلوی نہ مالکی اور حنبلی۔ سورہ الانعام میں ہے کہ قوانین خداوندی کی رو سے غلط نظام کے نتیجہ میں جو تباہیاں آتی ہیں اس کی کئی شکلیں ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہوجاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہوجاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں (۴۷۔۶/۴۵) کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط

پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور خانہ جنگی پر اتر آتے ہیں (۶/۱۳۰) اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تا کہ لوگ اچھی طرح بات سمجھ سکیں (۶/۶۵)۔قرآن کریم نے یہاں انسانی زندگی کے اجتماعی نظام کے بڑے عمیق حقائق بیان کئے ہیں۔کبھی (اور اکثر) ایسا ہوتا ہے کہ عوام تو ٹھیک ہوتے ہیں لیکن قوم کا اوپر کا طبقہ (ارباب اقتدار اور اعیانِ دولت وثروت) بگڑ جاتے ہیں اور ان کے بگڑنے سے سارا نظام تہس نہس ہو جاتا ہے۔اس طرح اس قوم پر تباہی آ جاتی ہے۔سورہ النمل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو قومِ ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ بارالٰہی! اس قوم کی اصلاح کس طرح ہوگی؟ وہ تو ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے۔اس کے ایک ایک فرد کی اصلاح (ناممکن نہیں تو) مشکل ضرور ہے۔ ارشادِ خداوندی ہوا کہ ساری کی ساری قوم بگڑی ہوئی نہیں' نہ ہی اس کے ایک ایک فرد کی اصلاح کی ضرورت ہے۔مملکت کے مرکزی مقام (دارالسلطنت) میں نو(۹) اربابِ اقتدار ہیں جو بگڑے ہوئے ہیں۔انہی کے تتبع میں ساری قوم بگڑ رہی ہے۔اگر ان نو(۹) کی اصلاح کر دی جائے تو ساری قوم کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی (۴۸/۲۷)۔ عوام' اکابرین قوم کی تقلید کرتے ہیں۔وہ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔اگر وہ بدعنوان ہوں تو ساری قوم میں بدعنوانی پھیل جاتی ہے۔وہ صحیح راستے پر چلیں تو قوم ان کی اتباع میں صحیح راستے پر چلتی رہتی ہے۔لہٰذا قوموں میں تباہی کی ایک شکل (یا ایک وجہ) یہ ہوتی ہے کہ اس کا طبقہ بالا بگڑ جاتا ہے' تو ساری قوم بگڑ جاتی ہے اور یوں مملکت میں بدنظمی پھیل جاتی ہے۔دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ اربابِ اقتدار کا ظلم و ستم اس قدر حد سے بڑھ جاتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے اور اس کے ردعمل کے طور پر عوام لاقانونیت پر اتر آتے ہیں اور اس طرح معاشرہ کا نظم ونسق تباہ ہو جاتا ہے اور ملک میں انارکی پھیل جاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی لیڈر نئی نئی اصطلاحات' سلوگن اور پرفریب وعدوں سے عوام کو اپنے پیچھے لگا کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور وہ پارٹیاں آپس میں ٹکرا کر ملک کو تباہ کر دیتی ہیں۔

محولہ بالا آیت (۶/۶۵) کے شانِ نزول میں صحیح بخاری جلد ۶ حدیث نمبر ۱۵۲ میں جبیرؓ سے روایت ہے کہ جب آیت کا حصہ قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم نازل ہوا تو رسول ﷺ نے کہا اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں (اس سزا سے) اور جب او من تحت ارجلکم نازل ہوا تو بھی رسول ﷺ نے کہا اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں (اس سزا سے) لیکن جب او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض ''اور کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے ہیں اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں'' نازل ہوا تو پھر رسول ﷺ نے فرمایا یہ ہلکا ہے (آسان ہے)۔

معزز قارئین غور کیجئے! فرقہ بندی اور پارٹی بازی جسے خدا نے شرک اور عذاب قرار دیا تھا اسے قرآن کے اس واضح اعلان کے خلاف صحیح قرار دینے کے لئے من گھڑت روایت کو کس طرح ظالمانہ انداز سے رسول ﷺ کی طرف منسوب کیا گیا اور اس کے اثبات کے لئے مزید کہا گیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اختلاف امتی رحمۃ میری امت میں اختلاف باعثِ رحمت ہے اور قرآن کہتا ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاء ھم البینت واولئک لھم عذاب عظیم۔ یاد رکھو! تم نے کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح قوانین خداوندی آ جانے کے بعد فرقوں میں بٹ گئے اور باہمد گر اختلافات کرنے لگ گئے۔ یہ بڑا سنگین جرم ہے اس لئے اس کی سزا بھی بڑی سخت ہے اس سے قومیں ذلیل وخوار اور تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ (جمعہ کے اجتماع میں ایک نوجوان لڑکے نے فرقہ واریت کے خلاف اور اس لعنت سے اجتناب پر مختصر سی تقریر کی۔ بعد میں مسجد کے خطیب شاہ جی اٹھے انہوں نے یہ کہہ کر لڑکے کی بات پر پانی پھیر دیا کہ میرے نانا رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے مطابق فرقے ختم نہیں ہو سکتے ضمناً)۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا ہو گا کیونکہ آپ ﷺ کوئی بات یا کام خلافِ قرآن نہیں کیا کرتے تھے تو ہمارے فتویٰ گر مفتیان کرام اسے انکارِ حدیث کہہ کر اس شخص کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایسی روایات سے اللہ۔ اس کے رسول ﷺ اور قرآن کے متعلق جو بھی تصور سامنے آتا ہے آتا رہے' مخالفینِ اسلام' مسلمان قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے شیعہ سنی فرقہ وارانہ جنگ بھڑکا کر اپنے منصوبے کی تکمیل کے قریب ہیں ان حضرات کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ ان کی ہٹ دھرمی بس ایک ہی ہے وہ یہ کہ کسی ایک بھی روایت (بے شک وہ خلافِ قرآن ہو۔ یا جس سے نبی ﷺ اور صحابہؓ کے کردار پر زد پڑتی ہو) اور کسی مفسر کی تفسیر پر آنچ نہ آنے پائے۔ ان بزعمِ خویش عاشقانِ رسول اور حامیانِ وضع روایات نے رسول کریم ﷺ کے اس حکم (حدیث) کو بڑے دھڑلے سے پسِ پشت ڈال رکھا ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو قرآن کے مطابق ہو اسے قبول کر لو اور جو (حدیث) قرآن کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔ (بحوالہ حنفی اصولِ فقہ کی مستند کتاب التوضیح والتلویح)

سَرِ ورق طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۲۰۰۶ء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ تمنا

آج نوعِ انسانی کا جمِ غفیر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی طور پر اپنے اپنے خودساختہ نظریات وتصورات کے فریبِ نفس میں مکمل طور پر اسیر ہونے کے باعث باہمد گر جس قدر غسلِ خوں میں مصروفِ کار ہے اس کے پیشِ نظر اگر اس دور کو تاریخ کا بدترین دور متصور کیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا دورِ حاضر کی اِس ناگفتہ بہ اور خون آلود بدنما تصویر کے اِن بدنما داغوں کو مٹانے کی خاطر نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اشد ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ رب العٰلمین نے ذکر للعالمین کی شکل میں انسانوں کی اس عالم گیر برادری کے لیے جو لاریب، بین، واضح، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہ اس نسخۂ کیمیا کو ایک بار پھر آزمالے۔ کیونکہ اِس نسخۂ کیمیا کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے کہ جو انسانی عقل کو کسی شکل میں بھی راہِ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیتا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ فہم وفراست اور دلیل و برہان کے چراغ روشن کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا چلا جاتا ہے، اور اس گم کردہ راہی کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس سراجِ منیر کا یہی وہ محکم سہارا ہے کہ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

برادرانِ عزیز! بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہی وہ جذبِ دروں تھا کہ جس کی بناء پر اُس نے اس فکرِ قرآنی کو عام کرنے کی غرض سے محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ کے آڈیو ویڈیو پر دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو سی ڈیز سے قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد اُنہیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ جس کے تحت ربِ کریم کی مہربانی سے زیرِ نظر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مذکورہ دروس میں سے اس وقت تک سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف ومریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ حج، سورۃ انبیاء، پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس طویل سفر کو مکمل کرنے کی غرض سے بزمِ لاہور آج بھی پوری

طرح سرگرمِ عمل ہے اور خیال ہے کہ سورۃ فاتحہ سے والناس تک کا یہ طویل سفر تقریباً چالیس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ چونکہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ ہے شاید اس کی بنیاد پر ہی علامہ اقبال نے کہا تھا کہ انسان کی موجودہ زندگی آنے والی زندگی کا دیباچہ ہے۔

اس سورۃ میں رب العزت نے اپنی بنیادی صفات ربوبیت عالمینی' رحمانیت' رحیمیت' اور مالکیت کو کچھ اس طرح ترتیب اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس سے انسان حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے' اس کے کائناتی کنٹرول کی ہیئت اور اس کی افادیت کے سمندر سے کچھ قطروں ہی سے اپنی تشنگی بجھا سکتا ہے۔ جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اشیائے کائنات کی نشو ونما کے پوشیدہ راز بتدریج اُس کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ البتہ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو اس کی موجودہ زندگی کے مقصدِ عظیم سے بڑی وضاحت اور بلیغ انداز میں آگاہ کر دیا ہے۔ بقول شاعر

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانئ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

سورۃ فاتحہ کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کے لیے ایک ایک درس مختص کیا جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو ان دروس کے مطالعہ سے ہی ہو سکے گا۔

برادرانِ عزیز! اس موقع پر یہ چیز بغیر کسی تامل کے علی وجہ البصیرت کہی جا سکتی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر جو قرآنِ حکیم ہی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور ہمیں یقینِ محکم ہے کہ موصوف کی عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کا یہ سرمایۂ حیات نوجوان نسل کے علاوہ ہر صاحبِ علم وفکر کے لیے ایک انمول خزینہ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعہ کے بعد آخر کار انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ قندیلِ آسمانی کا یہ نسخۂ کیمیا اس قدر واضح' لاریب' آسان اور ہر قسم کے تضادات سے پاک اپنے اندر ایک ایسا ملکہ لیے ہوئے ہے کہ جو دوٹوک الفاظ میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور مستقل طور پر نوعِ انسانی کے لیے تاحیات راہنمائی کا سہارا بنا رہے گا۔

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کہ اے نوعِ انسانی! تم اس ضابطہ حیات کے بلا مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ کیونکہ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ جو کچھ انسان اکٹھا کرتا ہے یہ اُس سے کہیں زیادہ قیمتی متاع ہے''۔

خدا کرے اس کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ملتِ اسلامیہ جو اس وقت افسردہ و پژمردہ حالت میں سرگرداں ہے وہ ایک بار پھر امتِ واحدہ کے پرنور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جائے۔ عزیزانِ من! آبِ حیات کی یہی وہ شرابِ طہور ہے کہ جس کے ساغر سے مانوس ہو کر انسان اُس حسن و جمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا جسے انسانی آنکھ کے لیے قدرت نے اپنے ہاں مستور کر رکھا ہے۔ اور پھر واقعاتی طور پر یہ باور کر لے گا کہ قرآنِ حکیم کا یہ قول یقینی طور پر حتمی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی امامت کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ حتمی اعتراف ہے کہ جس کی بناء پر یہ عالمگیر برادری مصائب و آلام کی موجودہ چیخ و پکار سے آزادی حاصل کرتے ہوئے فکرِ قرآنی کے مضراب سے نکلنے والی دھیمی دھیمی اور دلوں کو موہ لینے والے اُن مسحور کن نغموں کی پر کیف آوازوں سے لطف اندوز ہو سکے گی۔ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا یہی وہ حسین منظر ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمانِ عالم اس انتظار میں ہے کہ یہ بھٹکا ہوا راہی اس قندیلِ رحمانی کی روشنی میں اپنا سفرِ زندگی کب شروع کرتا ہے۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کے سلسلہ میں خواہ یہاں کی زندگی کے لمحات ہوں یا جہانِ فردا کا دورِ حیات' ربِ کریم تو ہر دور میں انسان کے لیے رب بھی ہے' الرحمٰن بھی' الرحیم بھی' اور مالک یوم الدین بھی۔ لہٰذا اس بناء پر خالقِ کائنات' کائنات کا مالک ہونے کے ناطے اس میں ہر آن اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یہ وہ صفاتِ ربِ کریم ہیں کہ جن کی ترجمانی کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

برادرانِ عزیز! آخر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
جنوری 2007

سورۃ الفاتحہ

(تمہید)

آغازِ سخن بسلسلۂ درس قرآنِ حکیم کراچی 1950ء

عزیزانِ من! یہ پرویز کی آواز ہے۔ میں اپنے مکان 25/B، گلبرگ 2، لاہور، پاکستان، سے بول رہا ہوں۔ آج اکتوبر 1979 کی 14 تاریخ ہے۔ میں آپ احباب سے مخاطب ہو رہا ہوں، اس کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ میں نے اپنی پوری زندگی اس کتابِ عظیم کے سمجھنے اور سمجھانے میں بسر کی ہے۔ پہلے عام مروجہ تراجم کے انداز سے، اس کتاب کو سمجھنے کی کوشش کی، لیکن اس سے کچھ بات سمجھ میں نہ آئی، تو میں نے پھر اس انداز سے کہ جس میں خود اس کتاب نے اپنے متعلق کہا ہے کہ اس کو سمجھا جائے، اس کے سمجھنے کی کوشش کی۔ قریب پچاس سال سے میں اس کوشش میں مصروف ہوں۔ [1] اس کے سمجھنے کے بعد مجھ پر یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ: ''دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دوں''۔ یہ فرمانِ خداوندی ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا تھا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (5:67) خدا کی طرف سے جو تجھ پر نازل کیا جاتا ہے، اسے دوسروں تک بھی پہنچا دے۔ خدا کی طرف سے ان کا یہ نازل ہونا، نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا لیکن قرآن کے نزول کے بعد یہ زندۂ جاوید کتاب قرآن کریم قیامت تک رہے گی۔ یہی فریضہ ہر اس شخص پر عائد ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کو سمجھے اور دوسروں تک بھی پہنچائے۔

اس فریضہ کی ادائیگی کا آغاز تو میں نے اس سے بہت پہلے، دہلی اور شملہ میں، متفرق خطابات سے کر رکھا تھا، لیکن پاکستان بننے

---

[1] اکتوبر 1979ء میں پرویز صاحب دروس قرآن کے دوسرے دور میں سورۃ لقمان تک پہنچ گئے تھے۔ ان ایام میں باہر کے احباب جو سورۃ الفاتحہ کے دروس پہلے دور کی کیسٹس کے ذریعہ سنا کرتے تھے، ان کا تقاضا تھا کہ پرویز صاحب اپنی آواز میں سورۃ الفاتحہ کے دروس کو دوبارہ ریکارڈ کروا دیں کیونکہ کیسٹس کی آواز کی کوالٹی میں کافی فرق پڑ گیا تھا۔ اس طرح پرویز صاحب نے دوبارہ سورۃ الفاتحہ کے دروس ریکارڈ کرائے اور چونکہ 1968ء کے بعد 1979ء تک ان کے فہم و بصیرتِ قرآن میں بھی اضافہ ہو گیا تھا اس لیے موجودہ دروس کی تعداد نو ہے جب کہ پہلے دور کے دروس قرآن کی تعداد آٹھ تھی۔

کے بعد ❶ قرآن کے درس کا سلسلہ میں نے کراچی میں 1950 میں، ❷ شروع کیا۔ اس وقت قرآن کا یہ درس مسلسل نہیں تھا، مختلف موضوعات سامنے آتے تھے اور ہر موضوع کے متعلق قرآنِ کریم میں جو کچھ آیا ہے اپنی بصیرت کے مطابق میں اسے سامعین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ یہ سلسلہ 1958 تک رہا جب تک میں کراچی میں رہا۔

لاہور میں ہفتہ وار درسِ قرآنِ حکیم کا آغاز

جب میں 1958ء میں کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آیا تو اسی سال یعنی 1958 میں، میں نے درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ یہاں، خود اپنے مکان پر، جاری رکھا۔ یہ ہفتہ واری درس تھا۔ چونکہ اس زمانے میں دفاتر وغیرہ میں چھٹی اتوار کے دن ہوتی تھی، اس لیے یہ درس اتوار کی صبح کو میرے مکان پر ہوا کرتا تھا۔ 1958ء سے لے کر 1967ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب اس پورے قرآنِ کریم کے پہلے سلسلہ درس کا اختتام ہوا، تو اسی اختتام کے ساتھ ہی یہ تقاضا شروع ہوا کہ مجھے ازسرِنو اس سلسلے کو جاری کرنا چاہیے کیونکہ اس دوران میں بہت سے ایسے احباب درس کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے جو پہلے دَور میں یا شروع میں شامل نہیں تھے یا بعد میں یا درمیان میں، آ کر اس پچھلے وقت کے لیے شامل نہ رہے۔ بہرحال ان سامعین کا تقاضا تھا کہ درس کا سلسلہ پھر شروع کیا جائے چنانچہ 17 مارچ 1968ء ❸ میں یہ سلسلہ ازسرِنو شروع کیا گیا۔ مسلسل درسِ قرآن کریم اس زمانے سے آج تک ہر اتوار کی صبح کو یہاں ہوتا آ رہا ہے اور اب جیسا میں نے عرض کیا ہے اکتوبر 1979 میں ہم سورۃ لقمان اکتیسویں سورۃ تک پہنچ پائے ہیں۔

---

❶ پاکستان کے قیام کے بعد، پرویزؒ دہلی اور شملہ سے بسلسلۂ ملازمت کراچی تشریف لائے۔ 1955ء میں قبل از وقت پنشن حاصل کر لی تاکہ وہ اپنے ہمہ اوقات و توجہات اپنی زندگی کے قرآنی مشن کے فروغ کے لیے وقف کر سکیں۔ اپریل 1958ء میں لاہور تشریف لے آئے اور موجودہ دارالقرآن و درسگاہ تعمیر ہو کر جولائی 1958ء سے سلسلۂ درس شروع ہوا۔ ابتداءً درس کے موضوعات اسلام کے بنیادی تصورات اور اصطلاحات رہے، جن کے بغیر مسلسل درسِ قرآن کی تفہیم آسان نہ ہو سکتی تھی۔ پہلا باقاعدہ درسِ قرآن ستمبر 1960ء میں شروع ہوا۔ جس کی تکمیل ایک مدتِ طویل یعنی سوا سات سال کے بعد اتوار 31 دسمبر 1967ء کو بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ (مرزا محمد خلیل: جشنِ نزولِ قرآن و تکمیلِ درس قرآن: استقبالیہ، مجلّہ طلوع اسلام، فروری 1968ء، ص ص۔ 9 تا 11)

❷ میں نے اس سلسلہ (درسِ قرآن) کو 1950ء کے قریب کراچی میں شروع کیا تھا۔ یہ وہاں مسلسل جاری رہا تآنکہ میں 1958ء میں لاہور منتقل ہو کر آ گیا اور اس سلسلہ کو یہاں جاری کر دیا۔ ابتدائی دو سال قرآنِ کریم کے بنیادی تصورات پیش کرنے میں صرف ہو گئے اور اس کے بعد 1960ء سے، اس کا مسلسل درس شروع کر دیا گیا۔ (پرویزؒ: جشنِ نزولِ قرآن و تکمیلِ درسِ قرآن: خطاب، موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال، مجلّہ طلوع اسلام، فروری 1968ء، ص ص 12 تا 19)۔

❸ سامعین درس (اوّل) کا اصرار تھا کہ محترم پرویزؒ اپنے اس درس کا دوسرا دَور شروع کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے طویل و عریض پروگرام کو التزاماً جاری رکھنا بڑا صبر آزما مرحلہ ہوتا ہے۔ انہوں نے احباب کے اس تقاضائے شوق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا لیکن اپنی صحت کی بحالی کے لیے صرف دو ماہ کے وقفہ کی ''درخواست کی'' جس پر احباب نے بادلِ ناخواستہ رضامندی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اب اس درس کا ازسرِنو سلسلۂ وسط مارچ سے شروع کیا جائے گا۔ (حوالہ: طلوعِ اسلام فروری 1968ء، ص 8 (ایک خصوصی اعلان) نیز مجلّہ طلوعِ اسلام اپریل 1968ء، ص 17)

قرآنِ کریم کا یہ درس یہاں قارئین تو بالمشافہ سنتے ہیں لیکن باہر کے احباب کے لیے اسے ٹیپس پر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ ٹیپس کے بعد جب کیسٹس کا سلسلہ جاری ہوا تو پھر اسے کیسٹس پر بھی منتقل کیا گیا اور اس طرح یہ درس مقامی نہ رہا' بلکہ پہلے پاکستان کے مختلف شہروں میں اس کا رواج ہوا اور اس کے بعد پاکستان کے باہر بھی مختلف مقامات پر مستقلاً بھی' انتظاماً بھی' اور صبح صبح بھی' بہت سے احباب نے اپنے ہاں کیا' بزموں نے بھی اس سلسلے کو مسلسل اپنے ہاں جاری رکھا اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ سلسلہ نہ صرف یہ کہ اس وقت رواں دواں جاری ہے بلکہ یہ حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے اس کرمِ بے پایاں پر جس قدر بھی اظہارِ تشکر کروں کم ہے۔

اس سلسلہ نو کی ابتداء جیسا کہ ظاہر ہے سورۃ الفاتحہ سے ہی ہونی تھی چنانچہ اس سورۃ کی تکمیل آٹھ درسوں میں' علاوہ اس تمہیدی درس کے ہوئی' احباب نے اپنی اپنی جگہ اس کو بڑی ہی کثرت اور وسعت سے پھیلایا اور اس کا اظہار بھی متعدد مقامات پر کیا۔ ان کا تاثر یہ ہے کہ اگر اسے دل کے کانوں سے سن لیا جائے تو قرآنِ کریم اکثر و بیشتر پورے طور پر سمجھ میں آ جاتا ہے یا کم از کم دین کی تعلیمات' اقوال' اسلام کے بنیادی نظریات' قواعد' اور پیام' انسان کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس لیے اس درس کے یہ کیسٹس عام طور پر مختلف مقامات پر بہت زیادہ سنائے گئے اور سنائے جاتے رہے ہیں۔ بعض مقامات سے اطلاع آئی کہ ان کے پرانے ہونے کی وجہ سے اُن کی آواز کچھ تھوڑی سی مفقود ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ میں ان درسوں کو یعنی سورۃ فاتحہ کی تفسیر کو' جو میں نے درسوں میں بیان کی تھی' اب از سرِ نو ریکارڈ کر دوں تاکہ آواز میں جو کہنگی پیدا ہو گئی تھی' وہ دور ہو جائے۔

سورۃ فاتحہ کی تفسیر کا از سرِ نو آغاز

ان احباب کے تقاضے کی تعمیل میں' میں ان درسوں کو از سرِ نو ریکارڈ کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ دروس تو صرف ٹیپس پر ریکارڈ ہوئے تھے' یہ کہیں پورے طور پر لکھے نہیں گئے تھے کہ انہی کو پڑھ کر میں ریکارڈ کرتا چلا جاؤں۔ یوں سمجھیے کہ میں از سرِ نو سورۃ فاتحہ کی تفسیر ان درسوں کے ذریعے سے بیان کروں گا۔ اصولی طور پر تو یہ وہی ہو گی جو کچھ میں نے پہلے پیش کیا تھا' لیکن ظاہر ہے کہ تفسیر کے اعتبار سے اس میں کہیں کچھ کمی اور کہیں کچھ بیشی آ جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کمی کچھ کم ہو گی اور بیشی شاید کچھ زیادہ لیکن 1968ء کے بعد اس گیارہ سال کے عرصے میں بہرحال قرآن کے متعلق میرا فہم' میری بصیرت' کچھ پہلے سے زیادہ ہی ہو گئی ہے' فکر میں بھی کچھ زیادہ عمق آ گیا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر اس میں ایسے نئے نکات بھی آئیں گے جو پہلے درسوں میں نہیں آ سکے تھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ اس سلسلہ نو کو جو میں اسی سورۃ کی تفسیر کے سلسلے میں' ان درسوں کے ذریعے آغاز کر رہا ہوں' ان تمام احباب تک پہنچانے کے لیے مجھے توفیق عطا فرمائے۔ **وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ**

قرآن حکیم کی بعض بنیادی اصطلاحات کی اہمیت

اس زمانے میں بھی میں نے سورۃ فاتحہ کے درس کا آغاز کرنے سے پہلے ہی ایک تعارفی درس بھی پیش کیا تھا اور اس میں' میں نے بتایا تھا کہ قرآنِ کریم کیا ہے' اس کو کیسے سمجھا جاتا ہے' اسے کیسے سمجھایا جاتا ہے' اس کی بعض بنیادی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ وہ ابتدائی تعارفی درس بھی بڑا ہی مقبول ہوا۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہی خطوط پر یہ تعارفی درس بھی دوبارہ ریکارڈ کر دیا جائے۔ اب وہ تعارفی درس پیش خدمت ہے۔

لفظ قرآن کا بنیادی مفہوم

سب سے پہلے صرف لفظ قرآن کو لیجیے۔ اس لفظ کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ عربی زبان میں مادہ کسے کہتے ہیں' اور اس کی خصوصیت کیا ہوتی ہے' اس کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ اس مادہ کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جمع کرنا اور محفوظ رکھنا''۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جمع اور حفظ بھی تو عربی زبان کے ہی الفاظ ہیں اور خود قرآنِ مجید نے بھی انہیں اپنے ہاں استعمال کیا ہے تو پھر اس لفظ کے مادہ ''ق ر ء'' میں کیا خصوصیت ہے کہ قرآن کا لفظ اس مادہ سے لیا گیا' جمع یا حفظ سے نہیں لیا گیا۔ قرآنِ مجید کا ایک اعجاز لفظوں کے انتخاب میں ہے اور اس کا یہ انتخاب خود پکار کر کہہ دیتا ہے کہ

ایں کتا بے نیست چیزے دیگر است

''ق ر ء'' کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کو اس طرح جمع اور محفوظ رکھنا جس طرح رحم مادر میں نطفہ محفوظ رکھا جاتا ہے''۔ ظاہر ہے کہ رحم میں نطفہ اس طرح محفوظ نہیں رکھا جاتا جس طرح مثلاً کسی تھیلی میں چند سکے محفوظ رکھے ہوں۔ وہ سکے جامد ہوں گے اور ویسے کے ویسے پڑے رہیں گے لیکن رحم میں نطفہ جامد نہیں ہوتا' اس میں بڑھنے' پھولنے' پھلنے' نشوونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک ضابطہ حیات ہے۔ اس لیے اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے اور یہ صلاحیت ہے کہ یہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے' یہ ہر زمانے میں انسانی فکر کی امامت کا فریضہ سرانجام دے' یہ کاروانِ انسانیت کے لیے' ہر منزل میں چراغِ راہ ہو' یہ کسی مقام پر بھی یہ نہ کہہ دے کہ مجھ میں اب آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام اسی ذات کو حاصل ہوسکتا ہے' جس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی صلاحیت ہو۔ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم کے احکام تو اپنے اپنے مقام پر محکم پہاڑ کی طرح اٹل ہیں' ان کے معانی اور مفہوم بھی خود قرآن نے متعین کر دیئے ہیں۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے کہ اس میں علم انسانی کی نسبت سے بڑھنے' پھولنے پھلنے' آگے جانے کی صلاحیت ہو تو یہ اُن حقائق کے

متعلق ہے جو قرآنِ کریم میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جسے خود قرآن نے ان حسین و بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔اب یہ جو میں نے اس آیت کے آخر میں (41:53) کہا ہے اور یہی کچھ میں اس کے بعد بھی کہتا چلا جاؤں گا تو آپ سمجھ لیجیے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ یہ (41:53) اس آیت کا حوالہ ہے جو میں نے ابھی تلاوت کی ہے یا اسی طرح جو آگے تلاوت کروں گا' یہ ان کے حوالے ہوں گے۔ میں اس طرح حوالے دیا کرتا ہوں کہ پہلے سورۃ کا نمبر ہوتا ہے اور اس کے بعد آیت کا نمبر ہے مثلاً: (41:53) کے معنی یہ ہیں کہ یہ قرآنِ کریم کی اکتالیسویں سورۃ کی ترپنویں آیت ہے تو یہ آیت جو میں نے ابھی پیش کی ہے' اس میں قرآن نے کہا تھا کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نوعِ انسان کو اپنی نشانیاں عالمِ انفس و آفاق میں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے کہ قرآن نے جو کچھ کہا ہے' وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔ یعنی جوں جوں انفس و آفاق میں پوشیدہ حقیقتیں بے نقاب ہوتی جائیں گی' قرآن کی صداقت مزید نکھر اور اُبھر کر سامنے آتی جائے گی' انسانی علم کی ہر تحقیق اور سائنس کا ہر یقینی انکشاف قرآنی دعاوی کی شہادت بنتا چلا جائے گا۔ دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (38:87) یہ عالمگیر انسانیت کے لیے ضابطہ ہدایت ہے' اس لیے وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (38:88) اس میں بیان کردہ حقائق' سب کے سب' ایک ہی وقت میں سامنے نہیں آ جائیں گے۔ یہ کچھ وقت کے بعد' بے نقاب ہوں گے اور ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ ہے لفظ قرآن کی' مادہ کے اعتبار سے خصوصیت۔ بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ قرآن عبرانی ہے اور اس کے معنی ہیں اعلان عام' جسے انگریزی میں Proclamation (اعلامیہ) کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کے معنی ہوں گے ''مملکت خداوندی کا اعلامیہ''۔ وہ جو عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی تھی: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (96:1) تو اس کے معنی ہوں گے: اٹھ اور دنیا میں اس خدا کی عالمگیر ربوبیت کا اعلانِ عام کر دے جس نے کائنات اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ انسانوں کی ربوبیت یعنی نشوونما' انسانوں کے ہاتھ میں نہیں رہے گی' یہ اس خدا کے نظام کی تحویل میں رہے گی' جس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی نشوونما کا ذمہ لیا ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! کیسا انقلاب آفریں ہے خدا کا یہ اعلان' جو اس روایت کی رو سے ہے کہ سب سے پہلی آیت یہ ہے جسے سب سے پہلے عالم انسانیت میں عام کیا گیا۔

خدا تعالیٰ نے قرآنِ حکیم کو ضابطہ حیات کے معنی میں کتاب بھی کہا ہے

اب آگے چلیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کو کتاب بھی کہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ ''ک ت ب'' ہے' جس کے معنی ''حکم دینے یا کسی بات کو واجب قرار دینے کے ہیں''۔ مثلاً قرآنِ مجید میں کتب علیکم الصیام (2:103) تم پر روزے فرض قرار دیئے گئے

ہیں۔ **کتب علیکم القتال** (2:216) تم پر عندالضرور تجنگ کرنا قانوناً لازم قرار دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے کتاب کے معنی ''ضابطہ قانون'' کے ہوں گے۔ قرآنِ کریم نے اس لفظ کو ان معانی میں خود استعمال کیا ہے۔ مثلاً سورۃ النساء میں پہلے تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ قانونِ خداوندی کی رو سے کون کون سے رشتے تم پر حرام ہیں اور اس کے بعد کہا ہے کہ **کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ** (4:24) یہ تمہارے لیے خدا کا قانون ہے۔ اسی جہت سے قرآن کے متعلق کہا کہ **فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ** (98:3) اس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔ لہٰذا قرآنِ کریم کو جب کتاب کہا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ''اس میں قوانین خداوندی دیئے گئے ہیں''۔

اس مقام پر، عزیزانِ من! ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ دنیا میں قوانین یا Laws دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جنہیں قوانین فطرت یا Laws of Nature کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہوتا ہے۔ قوانین فطرت کے متعلق ہر صاحبِ علم یعنی Scientist (سائنسدان) اس کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک بہت بڑے سائنسدان کے الفاظ میں یہ یوں ہے کہ ''ہم کتابِ فطرت کو پڑھتے ہیں، اسے لکھتے نہیں ہیں''[1] یعنی فطرت کے قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ موجود ہیں۔ ہم صرف ان کو سمجھتے ہیں، ان کا انکشاف (Discover) کرتے ہیں۔ جہاں تک دوسری قسم کے قوانین کا تعلق ہے، تو ان کے متعلق یہ سمجھیے کہ یہ وہ قوانین ہیں جن کا تعلق خود انسان کی اپنی ذات اور اس کی تمدنی زندگی سے ہے۔

انسانوں کے بنائے ہوئے معاشرتی قوانین فوز و فلاح کے حامل نہیں ہو سکتے

مغرب کے سیکولر نظام (Secular System) کی عمارت اس مفروضے پر استوار ہوتی ہے کہ انسانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ان قوانین کو خود وضع کریں یعنی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین انسانوں پر نافذ کیے جائیں، لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے تحت انسانی معاشرے کو فوز و فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین کے بنیادی اصول اور مستقل اقدار بھی قوانین فطرت کی طرح خدا ہی کی طرف سے ملنے چاہئیں۔ یہ اصول و اقدار وحی کی رو سے ملتے ہیں اور اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ قرآن نے جہاں انسانی زندگی سے متعلق قوانین کو کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے، وہاں اس نے قوانینِ فطرت کے لیے بھی یہی اصطلاح استعمال کی ہے۔ مثلاً سورۃ توبہ میں ہے کہ **اِنَّ عِدَّۃَ الشُّہُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰہِ اثۡنَا عَشَرَ شَہۡرًا فِیۡ کِتٰبِ اللّٰہِ یَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ** (9:36) یہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کی رو سے مہینوں کی تعداد بارہ ہے اور یہ اس زمانے سے مقرر ہے جب خدا نے ارض

---

[1] اس سائنسدان کا نام Sulivan (سلیوان) ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: We only read the Book of Nature, we Can`t write it (ہم صحیفہ فطرت کو پڑھ سکتے ہیں، لکھ نہیں سکتے)۔ اس کی تشریح کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل)، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور 2006ء ص ص۔ 510 تا 312۔

وسمٰوات کو پیدا کیا تھا۔ یعنی جتنی مدت میں زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتی ہے وہ ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے اور اس عرصہ کو بارہ پر تقسیم کر کے مہینوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کی رو سے، ہر سال کا ہر مہینہ، سابقہ سال کے اس مہینے کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟ اس کے متعلق میں متعلقہ مقام پر وضاحت کروں گا۔ اس وقت صرف یہ سمجھیے کہ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ بات قانونِ فطرت کی ہو رہی تھی یعنی اللہ تعالیٰ نے قانونِ فطرت کو بھی کتاب اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ مِنۡهَآ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ (9:36) ان بارہ میں سے چار مہینے ایسے ہیں جن میں جنگ ممنوع قرار دی گئی ہے۔ یہ قانون انسانی معاشرہ سے متعلق ہے، فطرت سے نہیں ہے اور اس کے بعد ہے کہ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ (9:36) یہ خدا کا دینِ قیم ہے یعنی قوانین فطرت اور انسانی زندگی سے متعلق قوانین دونوں کے مجموعے کا نام الدین ہے۔ اور یہی دینِ قیم ہے، یہی دین محکم ہے، خدا کی طرف سے دیا ہوا ہے۔

برادرانِ عزیز! ان تصریحات سے واضح ہے کہ کتاب اللہ کے دو حصے ہیں: ایک صحیفہ فطرت ہے، جو خارجی کائنات میں بکھرا پڑا ہے اور دوسرا صحیفہ وحی ہے، جس کا محفوظ اور مکمل مجموعہ قرآنِ کریم ہے۔

قوانینِ فطرت سے اعراض کا نتیجہ جہنم ہے

قرآنِ کریم کی رو سے یہ دونوں قوانین خدا کی طرف سے عطا کردہ ہیں اور دونوں کی پابندی ضروری ہے۔ قوانینِ فطرت کی پابندی سے فطرت کی قوتیں مسخر (Harness) ہو جاتی ہیں اور قوانینِ وحی کی پابندی سے یہ قوتیں انسانی ذات کی نشوارتقاء اور عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کی جاتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک ضابطہ قوانین سے بھی اعراض برتا جائے، تو زندگی کا اعتدال قائم نہیں رہتا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر قوانین فطرت سے اعراض برتا جائے تو دین مذہب میں تبدیل ہو کر خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا (2:85) دنیاوی زندگی میں ذلت وخواری کا موجب بن جاتا ہے اور اگر مستقل اقدارِ خداوندی سے اعراض برتا جائے، تو دنیا اس جہنم میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کے شعلے آج تمام اقوامِ عالم کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ اس روشِ زندگی کو قرآنِ کریم نے کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر سے تعبیر کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ہے کہ اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ (2:85) کیا یہ لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہیں، بلکہ اس میں تو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ کیا تم لوگ ایسے ہو کہ تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے سے کفر برتتے ہو، تو یاد رکھو! کہ فَمَا جَزَآءُ مَنۡ یَّفۡعَلُ ذٰلِکَ مِنۡکُمۡ اِلَّا خِزۡیٌ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ج وَیَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ یُرَدُّوۡنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الۡعَذَابِ ط (2:85) جو ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ دنیا کی زندگی میں ذلت وخواری اس

کے حصے میں آئے گی اور قیامت میں وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہوگا۔

انسانی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنا کفر ہے

تاریخِ انسانیت اس حقیت پر شاہد ہے کہ تسخیرِ فطرت اور مستقل اقدار کو جب بھی الگ الگ رکھا گیا' اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ انسانی زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت (Indivisible Unit) ہے۔ اسے مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب میں تفریق کا ایک پہلو تو یہ ہے' جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے یعنی قوانینِ فطرت اور مستقل اقدار میں مُـغَـایَـرَث [1] پیدا کرنا۔ دوسرا گوشہ یہ ہے کہ خود قرآنِ کریم کے ایک حصے پر عمل کرنا اور دوسرے سے اعراض برتنا۔ اس کا نتیجہ بھی ذلت وخواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے صدیوں سے یہی روش اختیار کر رکھی ہے اور اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ **کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ** (2:183) اور **کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ** (2:216) دونوں یکساں احکامِ خداوندی ہیں' لیکن ہم **کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ** (2:183) پر تو اس شدت سے عمل پیرا ہوتے ہیں لیکن **کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ** (2:216) کو اپنی زندگی سے یکسر خارج کر رکھا ہے حالانکہ مومن کی ساری زندگی مجاہدانہ عسکریت کی زندگی تھی۔ روزوں پر زور اور عسکری تربیت سے اجتناب' یہ کتاب کے ایک حصے پر ایمان اور دوسرے حصے سے کفر کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

الحاد

اتنا ہی نہیں کہ کتاب کے ایک حصہ پر عمل اور دوسرے سے مجرمانہ تغافل! قرآن کریم تو یہاں تک بھی کہتا ہے کہ کسی ایک قانون یا صفتِ خداوندی کی پابندی میں اس قدر شدت اختیار کر لینا کہ اس سے دوسرے قوانین یا صفاتِ الٰہیہ نظر انداز ہو جائیں' تو اس کا نتیجہ بھی خوشگوار نہیں نکل سکتا۔ ایک جگہ اس نے کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا** (41:40) جو لوگ ہمارے قوانین میں ایک طرف نکل گئے ان کی یہ روش ہماری نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرے مقام پر ہے کہ **وَ ذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ** (7:180) جو لوگ صفاتِ خداوندی میں سے کسی ایک صفت کو لے کر اس میں ایک طرف دُور تک نکل جائیں' تم ان سے کنارہ کشی کرو۔ مثال کے طور پر یہودی اور ہندو خدا کی صفتِ عدل میں اس قدر متشدد ہو گئے کہ انہوں نے لغزش خوردہ انسانوں کے لیے بازآفرینی کا کوئی دروازہ ہی کھلا نہ رہنے دیا۔ دوسری طرف عیسائیت' اس کی صفتِ رحیمیت میں اس قدر متشدد ہو گئی کہ اس نے زندگی سے عمل کو یکسر خارج کر دیا اور ہر بات کو خدا کا رحم اور Grace پر منحصر قرار دے دیا۔ قرآنِ کریم کی رو سے وہ روش بھی غلط تھی اور یہ بھی غلط۔ صحیح روش وہی ہے جو ان قوانین وصفات کی پابندی میں' صحیح تناسب وتوازن لیے ہوئے' انہیں علی حدِ بشریت' اپنے اندر

---

[1] غیریّت' بے گانگی

منعکس کرے اور عملی زندگی میں انہیں معیار قرار دے۔ اس وقت میں صرف انہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں تفصیل اس اجمال کی اپنی اپنی جگہ آپ کے سامنے بعد میں آتی رہے گی۔

قرآن حکیم کے علاوہ دنیا میں کوئی کتاب بھی بغیر سوچے سمجھے نہیں پڑھی جاتی

قرآنِ کریم کو کتاب کہنے سے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی مقصود تھا کہ یہ ایک کتاب ہے اور جس طرح تم کسی کتاب کو پڑھتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہو' اسی طرح اسے بھی پڑھو اور اس سے مستفید ہو۔ آپ سوچیے کہ اگر آپ کو کوئی ایسی کتاب دے دی جائے' جس کی زبان سے آپ ناواقف ہوں' تو آپ اس کتاب کو کبھی نہیں پڑھتے حتیٰ کہ اگر اُس کی زبان مشکل ہو' تو آپ اس کے دو چار صفحے پڑھ کر الگ رکھ دیتے ہیں کہ اس کا معیار میری علمی سطح سے اونچا ہے۔ اگر اس کتاب کا پڑھنا آپ کے لیے ضروری ہے تو آپ اس کی زبان سیکھتے ہیں اور اپنے اندر اتنی استعداد پیدا کرتے ہیں' جس سے وہ کتاب سمجھ میں آ جائے۔ آپ کبھی یہ نہیں کرتے کہ آپ وہ کتاب پڑھتے جائیں خواہ وہ آپ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ دنیا کی کسی کتاب کے ساتھ آپ یہ نہیں کرتے لیکن اس میں ایک استثناء (Exception) ہے اور وہ ہے قرآنِ کریم۔ اس کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کی زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو' اسے پڑھتے رہنا چاہیے' اس سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے' جسے اس شدت اور کثرت سے پڑھا جاتا ہو' اور اس کے ساتھ ہی دنیا کی کوئی اور کتاب ایسی نہیں جسے بے سمجھے پڑھا جاتا ہو۔

قرآنِ حکیم کے خلاف ایک گہری سازش

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآنِ کریم سے دور رکھنے کے لیے یا یوں کہیے کہ قرآن کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے یہ ایک بڑی گہری [1] سازش تھی' جسے تقدس (Sacred) کا لباس پہنا کر مزین بنا دیا گیا۔ یوں قرآن کتاب نہ رہا۔ معاف رکھیے' جنتر منتر (Mumbo Jumbo) کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ کتاب اور جنتر منتر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کتاب کے الفاظ سمجھ کر پڑھے جاتے ہیں اور جنتر منتر کے الفاظ بلا سمجھے دہرائے جاتے ہیں' یہاں تک کہ قرآن کے الفاظ کے تعویذ لکھے جانے لگے' اس کی آیات کے ورد ہونے لگے اور اس کا نام رکھا گیا ''اعمالِ قرآنی'' اور ایسا کرنے والا کہلانے لگا ''عامل''۔ سوچیے کہ ہم اس کتاب کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ یاد رکھیے! جب تک مسلمان قرآن کو کتاب نہیں سمجھتا' وہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ **(جاری ہے)**

---

[1] قرآنِ کریم کے خلاف مزید سازشوں (Conspiracies) کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 221 تا 242۔

قرآنِ حکیم نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں ہی مدون شکل میں موجود تھا

برادرانِ عزیز! یہاں ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ کے شروع میں کہہ دیا تھا کہ ذٰلِکَ الْـکِتٰب (2:2) یہ ایک ''کتاب'' ہے۔ عربوں کے ہاں کتاب کا لفظ اس وقت بولتے تھے جب ''منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی کر کے ان میں لوہے کا کڑا (Iron Ring) پرو دیا جاتا تھا یا سلائی کر دی جاتی تھی''۔ قرآن کو الکتاب کہنے سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ صحیفۂ مقدسہ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں ایک مرتبہ اور مدوّن کتاب کی شکل میں موجود تھا' جس کی شیرازہ بندی بھی ہو چکی تھی۔ سورۃ الطّور میں ہے کہ وَالطُّوْرِ o وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:1-3) قرآن سطروں میں لکھی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے اسے منتشر اوراق پر لکھا جاتا تھا اور بعد میں اس کی شیرازہ بندی کی جاتی تھی۔

عربوں کے ہاں ہرن کی کھال چھیل کر اسے (چرمی کاغذ) Parchment [1] کی شکل میں' قرطاس بنا لیتے۔ اسے رَقّ کہا جاتا تھا۔ جن تحریروں کو محفوظ رکھنا مقصود ہوتا' انہیں اس پر قلم بند کر لیتے تھے۔ جہاں تک کاتبینِ وحی کا تعلق ہے' سورۃ عبس میں ہے کہ قرآن کی کتابت بڑے باعزت اور قابلِ اعتماد کاتبوں نے کی تھی (80:15-16)۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قرآن جمع اور مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تدوین بعد میں منتشر ٹھیکریوں' ہڈیوں اور پتوں کی مدد سے حضرت ابوبکر صدیق (632-634) یا حضرت عمر فاروق (634-645) یا حضرت عثمان غنی (645-656ء) رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوئی تھی' وضعی ہیں' جنہیں قرآن کی اہمیت اور خصوصیت کو نظروں سے گرانے کے لیے اختراع کیا گیا ہے۔ قرآن حضورؐ کے زمانے میں' حضور ﷺ کی زندگی میں ہی' اسی شکل میں مرتب' مدوّن' قرطاس پر موجود تھا' جس شکل میں آج ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ اس میں ایک لفظ بھر کی کمی بیشی کہیں نہیں ہوئی۔ اسی مرتب اور مدوّن کتاب کے متعلق کہہ دیا گیا کہ یہ کتاب مکمل ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا: وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ ج (6:116)۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ خدا نے اسے نازل کیا ہے اور وہ خود اس کی حفاظت کا ذمے دار ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9)۔ خدا نے اس

---

[1] Parchment: بھیڑوں' بکریوں' میمنوں یا بچھڑوں کی کھال جسے اس طرح تیار کیا جائے کہ اس پر لکھا جا سکے۔ (حوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی (مدیر): قومی انگریزی اردو لغت' مقتدرہ قومی زبان' اسلام آباد' 1992' ص 1412) نیز.....

The skin of a sheep, or goat, prepared for writing or painting upon A written text. stiff, durable paper made in imitation of the material. Pergamum in Western Turkey (where it was first used as a substitute for Papyrus) (Ref. Reader`s Digest (1990) Universal aictionary. London: The Readers Digest Association Limited. pp.1124-1125)

کی تصریح فرمادی کہ قرآنِ کریم ایک مرتب کتاب کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں موجود تھا۔ یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور یہ بھی کہ یہ قیامت تک کے لیے محفوظ رہے گا۔

ختمِ نبوت

برادرانِ عزیز! اس سے آپ' علاوہ دیگر امور' اس حقیقت کو بھی دیکھ لیں گے کہ قرآنِ کریم نے ختمِ نبوت کی حقیقت کو کس طرح واضح کر دیا ہے۔ جب ایک ایسا ضابطہ حیات ہو جو تمام نوعِ انسان کے لیے' قیامت تک کے لیے' مرتب اور محفوظ شکل میں دے دیا گیا ہو اور اس کے بعد اس میں کوئی تبدیلی بھی نہ کر سکتا ہو' تو ایسی کتاب کی موجودگی میں کسی نبی یا رسول کے آنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن کی ابدّیت' اکملیّت' محفوظیّت اور عالمگیریّت خود ختمِ نبوت کی دلیل ہے۔ قرآن کی نص صریح کی روح سے کوئی نبی یا رسول بغیر کتاب کے نہیں آیا لہٰذا جب خدا کی طرف سے آخری کتاب دی جائے تو اس کا لانے والا خود بخود آخری رسول ہو جائے گا۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں اور اس کی کتاب آخری کتاب ہے جو قیامت تک کے لیے محفوظ ہے۔

قرآنِ حکیم کے لیے عربی زبان کی خصوصیات کی وضاحت

اب آیئے قرآن کریم کی زبان کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا ہے کہ یہ کتاب بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (26:195) ہے۔ یعنی اس کتاب کی زبان عربی مبین ہے اور دیگر مقامات پر بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ یہ کتاب عربی مبین میں نازل ہوئی ہے۔ خود لفظ عربی کے معنی بھی ''فصیح اور واضح کے ہیں'' اور جب اس کے ساتھ ''مبین'' کا اضافہ کر دیا جائے تو اس کے واضح تر ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ یہ کتاب واضح ہے اور غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ (39:28) ہے' یعنی اس میں کوئی پیچ وخم نہیں' ابہام نہیں' التباس نہیں: صاف' نکھری' سیدھی' واضح' کتابِ روشن' حتیٰ کہ قرآن کو نور بھی کہا گیا ہے' یعنی خود روشن اور دنیا کو روشن کرنے والی کتاب۔ جس طرح روشنی اپنے وجود کو یا اپنے آپ کو دکھانے کے لیے کسی اور روشنی کی محتاج نہیں ہوتی' اسی طرح قرآنِ کریم بھی اپنے مطالب ومفاہیم واقدار واصول وپیغام وتعلیم کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی وضاحت ذرا آگے چل کر آئے گی۔

قرآنِ حکیم صرف اپنے الفاظ میں ہی قرآنِ حکیم ہے

جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے' قرآنِ کریم کی زبان اس کے علاوہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اصول یہ بتایا ہے کہ جس قوم کی طرف کوئی رسول بھیجا جاتا ہے' اُس رسول کا پیغام' اُسی قوم کی زبان میں ہوتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے اوّلیں مخاطب عرب تھے اس لیے قرآنِ کریم انہی کی زبان میں آیا اور انہی کی زبان میں آنا چاہیے تھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مشیت کے

پروگرام میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زبان جس میں قرآن نازل ہونا تھا' ایسی جامع' عمیق اور وسیع ہو کہ وہ قرآنی حقائق کی متحمل ہو سکے۔ علم الالسنہ کے ماہر بتاتے ہیں کہ اس باب میں دنیا کی کوئی زبان عربی زبان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تو خدا نے انہیں بیٹے کے حلق پر چھری چلانے سے روک دیا اور کہا کہ ہم اسے ایک عظیم قربانی کے لیے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے تھے اور باپ کی مملکتِ عظیم کا انہی کو وارث ہونا تھا لیکن حکم یہ دیا گیا کہ انہیں حجاز کی وادیٔ غیر ذی زرع میں بسایا جائے۔ غیر ذی زرع کہ جہاں کچھ اگتا ہی نہیں' جہاں کچھ ہوتا ہی نہیں۔ کہا کہ انہیں اس وادی میں بسایا جائے تا کہ یہ وہاں خانۂ خدا کی تولیت کا فریضہ سرانجام دیں اور مملکتِ شام کی سرداری حضرت اسحاق علیہ السلام کو دے دی جائے۔ اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد بنی اسرائیل' امورِ جہاں بانی میں مصروف رہی۔ اس کے حصے میں شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی آئی' لیکن بنی اسماعیل اسی وادیٔ غیر ذی زرع میں نہایت سادہ زندگی بسر کرتے رہے۔ انہوں نے نہ کوئی حکومت قائم کی اور نہ ہی کسی تہذیب وتمدن کی بنا ڈالی' یہ ایک ہی کام کرتے رہے یعنی عربی زبان کی تشکیل' تعمیر اور تہذیب۔ انہوں نے اس زبان کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ دنیا کی کوئی زبان اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔

یہ ہمارا عقیدت مندانہ دعویٰ ہی نہیں بلکہ دنیا کے محققین پوری تحقیق وتفتیش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر بک [1] (Dr. Bucke) نے اپنی مشہور کتاب Cosmic Consciousness میں مشہور مستشرق Max Muller کی تحقیقات کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جس زمانے میں تمام انڈو یورپین زبانوں (Indo-European languages) میں مادی تصورات (Root Concepts) کی تعداد ایک سو اکیس (121) تک پہنچ پائی تھی' عربوں کے ہاں صرف اونٹ کے تضمنات میں پانچ ہزار سات سو چوالیس (5744) الفاظ موجود تھے۔ سوچیے' اس سے اس زبان کی وسعتوں کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

عربی زبان کے مادوں کی تعداد 25 ہزار کے قریب ہے

عزیزانِ من! یہ عربی زبان بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ اس میں ایک مادہ یعنی Root ہوتا ہے جو عام طور پر تین حرفوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس مادے کے معانی میں ایک بنیادی خصوصیت ہوتی ہے' جو ان تمام الفاظ میں جھلکتی چلی جاتی ہے' جو اس مادے سے مختلف ابواب میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مادوں کی تعداد پچیس ہزار (25000) کے قریب ہے۔ آپ اندازہ لگا لیجیے کہ ان مادوں سے جو الفاظ بنائے گئے ہوں گے' ان کی تعداد کس قدر ہو گی' اور پھر اس میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہیں' اوزان ہیں' ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوتی ہے۔ یعنی ایک مادہ یا Root ہے' جس کی ایک متعین خصوصیت ہے۔ وہ

---

[1] Richard maurice Bucke.

خصوصیت ہر اس لفظ میں پائی جائے گی جو اس Root (مادہ) سے بنے اور پھر وہ الفاظ ان ابواب کے مطابق بنیں گے اور ہر باب کی ایک الگ خصوصیت ہوگی۔ اس لیے جو لفظ بھی آپ کے سامنے آئے' اس کے باب کو دیکھیے۔ اور اس کے Root (مادہ) کو دیکھیے۔ ان دونوں کو ملانے سے اس کا ایک متعین مفہوم آپ کے سامنے آ جائے گا۔ یہاں تک کہ یہ ترتیب اس مادے میں فلاں اور فلاں حرف اکٹھا آئے تو اس کی یہ خصوصیت ہوگی' یعنی جتنے بھی Roots (مادے) ایسے ہوں گے جن میں وہ دو حرف آ جائیں ان میں وہی خصوصیت ہوگی' جو ان دو حرفوں کے اکٹھے ہونے سے بتائی گئی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی ایسی ہے جو اس کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہ تھی وہ زبان جس میں قرآن نازل ہوا۔ ❶

قرآنِ حکیم کی عربی زبان آسان ترین بھی ہے اور نہایت عمیق و وسیع بھی

پہلے تو یہی بات یہاں سے سمجھ میں آتی ہے کہ یہ زبان بڑی سائنٹیفک (Scientific) واقع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کا سمجھنا بڑا آسان ہے۔ یہ جو اس زبان کو ہوّا بنا کر رکھ دیا گیا ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے' جس کا مقصد یہ ہے کہ عام مسلمان قرآن کو براہِ راست سمجھنے نہ لگ جائے اور یہ خاص طبقے کی اجارہ داری رہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ میں سے کسی نے عربی ادب پر حاوی ہونا ہو' تو وہ واقعی بڑی محنت بھی چاہتا ہے' بڑی وسعت و معلومات چاہتا ہے' تعلیم میں بھی بہت آگے بڑھنا پڑھتا ہے لیکن قرآنِ کریم تو اس قدر آسان عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے یعنی عجیب چیز ہے کہ زبان کے اعتبار سے اتنا جامع' اتنا وسیع' اتنا عمیق اور سمجھنے کے اعتبار سے اس قدر آسان! خود اس کا دعویٰ ہے کہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (54:16) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے بڑا آسان بنایا ہے۔ دوسری جگہ ہے کہ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (41:3) یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو نکھار کر' الگ الگ کر کے' واضح طور پر' بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ قرآن اُن لوگوں کے لیے جو علم و بصیرت سے کام لیں' ایک واضح ضابطہ حیات بن گیا۔ یہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (16:89) ہے یعنی جن امور کا ذکر اس میں کیا گیا ہے' انہیں بڑی وضاحت سے کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

ان تصریحات سے ایک بات واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آئے ہیں' پہلے Roots ❶ یا مادہ کی روح سے ان کے معانی متعین کیے جائیں اور پھر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نزول قرآن میں ان الفاظ کے معانی کیا لیے جاتے تھے۔ ایک لفظ کے Shape (شکل و ساخت) کے اعتبار سے کئی ایک معانی یا مفہوم

---

❶ ان نکات کی مزید تشریح و تبیین کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ انبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 21-20؛ بالخصوص انہی صفحات کے فٹ نوٹ (1,2)20 اور (4-3)21۔

ہوتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قرآنِ کریم نازل ہوا تھا عرب اس کے کیا معنی لیتے تھے۔

ہزار سال سے مرتب کی جانے والی لغات کی ایک بنیادی کمزوری

برادرانِ عزیز! قرآنِ کریم کا مفہوم اُسی صورت میں سمجھ میں آ سکتا ہے جب پہلے یہ معلوم ہو کہ زمانہ نزول قرآن میں عرب ان الفاظ کا جو قرآنِ کریم میں آئے ہیں کیا مطلب یا معنی لیا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم کے متعلق ہمارے ہاں اس ہزار سال میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس سے کمروں کے کمرے بھر جائیں لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ قرآنِ مجید کا کوئی لغت ایسا نہیں جو اس انداز سے مرتب کیا گیا ہو۔ یعنی جو چیز قرآن کے سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے' وہ چیز ہمارے ہاں کے اس لٹریچر میں کبھی مرتب ہی نہیں ہوئی۔ لے دے کر ایک امام راغب اصفہانی [1] (متوفی قریب 502ھ) کی لغت ہے' جسے المفردات فی غریب القرآن کہتے ہیں لیکن وہ بڑا مختصر سا لغت ہے۔ وہ اس نہج پر مرتب نہیں کیا گیا جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ [2]

لغت کے مرتب کرنے میں میری سعی و کاوش

قرآنِ کریم کا صحیح مفہوم سمجھنے کے راستے میں میری سب سے بڑی اور پہلی دشواری بھی یہی اسی قسم کے لغت کا فقدان تھا۔ لہٰذا میرے لیے ایسا لغت مرتب کرنا یوں کہیے کہ میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ تنہا بے ساز و سامان کوئی رفیقِ کار نہیں' کوئی جماعت نہیں اور پھر غالباً آپ احباب کو اس کا علم ہوگا کہ میں مرکزی حکومتِ ہند میں ملازم بھی تھا لیکن چونکہ مجھے قرآنِ کریم کے ساتھ عشق تھا اور عشق اس قسم کی خارا شگافیوں کو آسان بنا دیا کرتا ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس قسم کے لغت مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔ [2] اللہ تعالیٰ کا یہ فضل و کرم سمجھیے کہ میں برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد اس میں کامیاب ہوا اور میرا یہ لغت چار جلدوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے اور بڑا ہی مقبول ہوا ہے کیونکہ یہ اپنے انداز کی منفرد ڈکشنری یا لغت ہے' جس کا کہیں دوسرا جواب نہیں ملتا۔ اس پر میں بدرگاہِ رب العزت جس قدر بھی سجداتِ شکرانہ ادا کروں' کم ہیں۔ اس لغت کی مدد سے قرآنِ کریم کے الفاظ کے صحیح معانی

---

[1] Imam Raghib AL-Isphahani of Persia (1327-1409A.D) (He was) beheaded. (Re. Some Quranic Voices by Shabbir Ahmed, M.D. Florida, USA, Through Website sent on Saturday, April 01, 2006, 6:03pm on the Subject. 2: Analysis of Criticism Against Quran upholders (Questions/Answers): Website Islamdawn.

[2] مزید لغت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور 2005ء' ص ص 55-154 اور انہی صفحات کا فٹ نوٹ 2۔

تو متعین ہو گئے۔ بظاہر یہ نظر آئے گا کہ اس کے بعد قرآنِ کریم کی آیات کا ترجمہ کرنا بہت آسان ہو جائے گا یا بہت آسان تھا لیکن یہاں ایک اور دشواری شروع ہوئی۔

الفاظ کے معنی تو یہ کیے لیکن قرآنِ کریم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی کردہ کتاب ہے اور اس کے تو اعجاز ہی اس قسم کے ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر یہ کتاب کس انداز سے مرتب ہوئی ہے۔ اس کا انداز گرانقدر معجزانہ ہے۔ اس میں اس کے خاص اسلوب کو بنیادی دخل ہے۔ اس کی آیتوں کے اندر جو الفاظ آئے ہیں' ان کی ترتیب اور ترکیب تو کچھ اس انداز کی ہے کہ ان کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ بات میں محض اعتقاد کی بنا پر نہیں کہہ رہا بلکہ یہ وہ حقیقت ہے جسے ہم تو ایک طرف' مغرب کے بڑے بڑے مستشرقین' جو عربی زبان کے فاضل ہیں' وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس کی زبان کا اسلوبِ بیان اس قسم کا ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں ہو نہیں سکتا۔ H.A.R Gibb عربی زبان کا بہت بڑا فاضل ہے۔ اس کی ایک کتاب Modern Trends In Islam (اسلام میں جدید رجحانات) ہے۔ اس کا 1945 کا ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا..... جس طرح کسی بلند شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ وحی کی زبان ہی مختلف ہوتی ہے..... قرآنِ کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرو تو اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اس کے عربی زبان کے تراشے ہوئے نگینوں کے گوشوں کو جامع طور پر سامنے لانے کے بجائے' مترجم اپنے وضعکردہ ایسے الفاظ استعمال کرے گا جو اصلی الفاظ کی وسعت اور جامعیّت کو مقید کر دیں گے۔ ایسی آیات میں' جن میں عام واقعات یا قوانین و احکام مذکور ہوں' ترجمہ کا یہ نقص شاید زیادہ نقصان رساں نہ ہو لیکن' بایں ہمہ' جو مدوجزر' جو نشیب و فراز' جو بلندیاں اور گہرائیاں' جو لطافتیں اور باریکیاں' اور اس کے ساتھ جو جوش و خروش' اصل کتاب میں جلوہ فرما ہے' وہ ترجمہ میں کیا آ سکے گا! ذرا اس صاف اور سیدھی سی آیت کو لیجیے: اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (50:43) اور انگریزی ہی نہیں' دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ کر کے دکھایئے۔ اس کے چھ الفاظ میں' جو پانچ مرتبہ ''ہم (We)'' کی تکرار ہے' اسے کون سی زبان ادا کر سکے گی؟''

قرآن حکیم کے ترجمہ کی بجائے اس کا مفہوم بیان کرنے کی طرح ڈالی گئی

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے الفاظ کے معانی متعین کرنے کے بعد بھی اس کی آیات کا ترجمہ کرنا میرے لیے کیا' کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔ لہٰذا میں نے ترجمے کے بجائے قرآنِ کریم کا مفہوم لکھا۔ اس کا نام ہے ''مفہوم القرآن''۔ میرا یہ ''مفہوم القرآن'' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے الحمد سے والناس تک مسلسل تیس پاروں کا مفہوم ہے۔ اور وہ نہایت حسن و خوبی سے شائع ہو چکا ہے۔ اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے' وہ متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس سے

قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم کی وضاحتوں کے بارے میں ارشاد خداوندی

یہ کچھ تو قرآنِ کریم کی آیات کے مفہوم کے متعلق تھا جب کہ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم کا ایک اور اہم باب بھی ہے جو اس نازل کرنے والے خدا نے کہا ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (75:19) قرآن کی وضاحت خود ہمارے ذمے ہے۔ اس کے لیے طریق کیا اختیار کیا گیا ہے' یہ بات غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قرآن کا انداز عام کتابوں جیسا نہیں۔ عام کتابوں کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں وہ کتاب مختلف ابواب میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ ہر باب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے اور اس موضوع سے متعلق تعلیم اس باب کے تحت مربوط طور پر دے دی جاتی ہے یعنی جب ایک باب ختم ہوتا ہے تو جو کچھ اس موضوع کے متعلق کہنا مطلوب و مقصود ہے' وہ اس باب کے اندر آ جاتا ہے۔ قرآن اس طرح کی تصنیف کردہ کتاب نہیں۔ یہ یوں سمجھیے کہ جیسے تیئیس سال میں عطا فرمودہ مختلف خطبات کا مجموعہ ہو۔ اس میں ایک بات ایک مقام پر آئی ہے۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے مقام پر ہے' تفسیر کسی اور جگہ ہے' استثناء کسی اور سورت میں ہے۔ نیز مختلف حقائق کو مختلف واقعات کے ضمن میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اسے تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانا۔ سورۂ انعام میں ہے کہ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6:105)۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن میں مختلف آیات کو پھیر پھیر کر اس لیے لایا گیا ہے کہ بات اس طرح واضح ہو جائے جیسے چھلکا اور مغز الگ ہو جاتے ہیں اور یوں بات نکھر اور ابھر کر سامنے آ جائے۔ اس کے بعد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے دو بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک محاورۂ عرب یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی زبان کے ان الفاظ کا جو قرآن میں استعمال ہوئے ہیں' وہ مفہوم' جو عرب لیتے تھے' اس سے واقفیت۔ دوسری بات قرآنِ کریم پر اتنا عبور ہو کہ جو بات کسی ایک آیت میں کہی گئی ہے یہ چیز بیک وقت آپ کے سامنے آ جائے کہ اس کے متعلق قرآن کے دیگر مقامات میں کیا آیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے انسائکلو پیڈیا یا تبویب کی اہمیت اور اس کی تیاری کا مرحلہ

جس طرح قرآنِ کریم کے الفاظ کے متعلق بیان کیا گیا ہے' اس قسم کا بھی کوئی لغت پہلے سے موجود نہیں تھا۔ قرآنِ کریم کے اس انداز کو آپ انسائیکلو پیڈیا کہیے کہ عربی زبان میں اسے تبویب [1] کہتے ہیں' یعنی باب کرنا قرآنِ کریم کے متعلق اس قسم کی بھی کوئی کتاب اس سے پہلے موجود نہیں تھی' یعنی ایسی کتاب جو ہر اس موضوع کے متعلق بیک وقت بتا دے جو آپ کے ذہن میں آئے کہ قرآنِ کریم

---

[1] قرآنی موضوعات کو تبویب کی شکل میں پیش کرنے کے موضوع کے متعلق مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ حج' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 170 تا 171۔

میں یہ موضوع کس کس مقام میں آیا ہے' اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے' وضاحت کہاں ہے' اضافہ کہاں ہے' استثنا کہاں ہے' تشریح مزید کہاں ہے' براہِ راست یہ کچھ کہاں کہاں کہا گیا ہے یا کسی واقعہ کے ضمن میں یہ کچھ کس کس جگہ ہے۔ یہ تمام چیزیں بیک وقت سامنے آ جائیں اور غور فرمایئے عزیزانِ من! کہ یہ مرحلہ پہلے سے بھی زیادہ دشوار گزار اور محنت طلب تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس تبویب یا انسائیکلو پیڈیا کا بھی آغاز کر دیا اور اس کے فضل و کرم سے اس میں اس طرح کامیاب ہوا کہ میری تبویب القرآن' قریباً دو ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب شائع ہو کر بڑی ہی مقبول ہو چکی ہے۔ [1]

اب آپ سوچ لیجیے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کے لیے جو کچھ میں نے کیا ہے' وہ کس قدر محنت طلب مرحلہ تھا۔ پہلے جس انداز سے سمجھا اور پھر اس کو سمجھانے کا جو انداز ہے' اس کے لیے لغات القرآن ہے یہ لغات القرآن صرف قرآنِ کریم کے الفاظ کے وہ معانی بتاتا ہے' جو زمانہ نزولِ قرآن میں عرب لیتے تھے' پھر ان معانی کی رو سے سارے کے سارے قرآن کا مفہوم مرتب کیا اور قرآن کے موضوعات کے متعلق اس قسم کی تبویب کا انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا کہ جو موضوع آپ کے سامنے آئے' آپ کو بیک وقت معلوم ہو کہ قرآن میں اس کے متعلق کیا کیا آیا ہے۔ ان چیزوں کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کی کسی اور چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قرآنِ حکیم پر غور و فکر کی شرط ہر دَور کے لیے لازم ہے

عزیزانِ من! ان دونوں شرطوں سے زیادہ اہم ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے تدبر فی القرآن (4:82) یعنی قرآنِ کریم کے سمجھنے میں غور و فکر سے کام لینا۔ آپ قرآنِ کریم کے ورق الٹیے' قریب قریب ہر صفحہ پر آپ کو علم و بصیرت اور عقل و شعور سے کام لینے اور غور و فکر کرنے کی تاکید ملے گی۔ تدبر کا حکم نہ کسی خاص فرد کے لیے ہے' نہ کسی خاص زمانے کے لیے ہے' وہ تمام افراد کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے ہے۔ اس لیے قرآن کو تقلیداً سمجھا ہی نہیں جا سکتا' نہ ہی کسی ایک فرد کا تدبر و تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت ہو سکتا ہے۔ یعنی اس طرح سے نہیں ہے کہ کسی خاص زمانے میں' کسی خاص فرد نے' جو قرآنِ مجید کی کوئی تفسیر لکھ لی' وہی ہمارے لیے بھی کافی ہو گئی۔ ایسا نہیں ہے۔ یہ ہر زمانے کے مسلمان کو' ہر زمانے کے انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کرے۔ اس لیے کسی ایک فرد کا تدبر اور تفکر دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہو سکتا۔

---

[1] ان کی مزید تشریح و وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان انتیسواں پارہ' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء

قرآنِ حکیم سے استفادہ کرنے والے کے لیے وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہوگا

قرآنِ کریم پر غور کرنے والے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے زمانے میں جس سطح تک علمِ انسانی پہنچ چکا ہے' اس پر اس کی نگاہ ہو۔ قرآن انسانی زندگی کے تقاضوں کا حل پیش کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ ہی معلوم نہ ہو کہ اس کے زمانے کے انسانی تقاضے کیا ہیں' تو وہ قرآن سے کیا رہنمائی حاصل کر سکے گا۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جس طرح ایک فرد کا تدبر فی القران دوسرے کے لیے سند اور حجت نہیں ہوسکتا' اسی طرح جو کچھ قرآن کے متعلق کسی ایک زمانے میں سمجھا گیا ہو' وہ بھی حرفِ آخر نہیں ہوسکتا۔ جوں جوں علمِ انسانی بڑھتا جائے گا' نت نئے قرآنی حقائق واضح ہوتے چلے جائیں گے۔

قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے

اب آگے چلیے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا (4:82) کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر نہیں کیا؟ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں کئی اختلاف پاتے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں اختلاف نہیں اور یہ چیز اس کے من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل ہے۔ ہمارے ہاں عام طور کہا جاتا ہے کہ قرآن کے الفاظ میں تو کوئی اختلاف نہیں یعنی جتنے بھی قرآن کے نسخے ہیں' ان میں متن (Text) ایک ہی جیسا ہے' اس میں کوئی اختلاف کی بات نہیں' کوئی اختلافی چیز نہیں۔ سب جگہ یہی الفاظ ہیں کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں لیکن اس کی تعبیرات (Interpretations) مختلف ہوسکتی ہیں۔ آپ سوچیے کہ لفظی اختلافات کا نہ ہونا بھی کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کا اس تحدی سے ذکر کیا جاتا؟ بات تو ساری تعبیرات کی ہے۔ اگر کسی کتاب کی عبارت کی کیفیت یہ ہو کہ وہ زید کو کوئی مفہوم دے اور بکر کو اس کے بالکل متضاد مفہوم' تو کیا اہلِ علم کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت ہوسکتی ہے؟ یاد رکھیے! قرآنِ حکیم کی کسی بات میں بھی تضاد نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم پر تدبر مشروط ہوگا

قرآن سمجھنے کے لیے جو شرائط خود قرآن نے مقرر کی ہیں' اگر ان کے مطابق قرآن میں تدبر کیا جائے' تو اس کے کسی حکم کی دو تعبیرات (Interpretations) ہو ہی نہیں سکتیں۔ اس لیے اگر امت قرآن کو اپنی سمجھ اور حجت اور آخری دلیل تسلیم کر لے' تو امت

میں کسی قسم کا تفرقہ اور اختلاف پیدا ہی نہیں ہوسکتا؟

اس مقام پر ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم میں کچھ تو احکام وقوانین دیئے گئے ہیں اور کچھ حقائق۔ احکام وقوانین کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کے معانی متعین اور ٹھوس (Concrete) ہیں لیکن حقائق بالخصوص وہ حقائق ،جن کا تعلق مابعدالطبیعات (Meta -Physics) سے ہے، انہیں تشبیہات کے انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اہلِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ تشبیہات واستعارات سے ہر شخص اپنے اپنے فہم اور علمی سطح کے مطابق مشبہ بہ کے متعلق تصور قائم کرسکتا ہے۔ ان تصورات میں اختلاف ہوگا لیکن جہاں تک قرآنی ہدایت کا تعلق ہے، ان کی دو تعبیریں نہیں ہوسکتیں۔ یہ احکام وقوانین اسلامی نظام کی طرف سے نازل ہوں گے، اس لیے ان کی عملی جزئیات میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ یوں امت میں وحدت فی العمل پیدا ہوجائے گی اور قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لیے فکری آزادی بھی قائم رہے گی۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں شرط اول قلب ونگاہ کی بالیدگی ہے

عزیز برادران! ان تمام شرائط سے کہیں زیادہ گہری شرط ایک اور ہے اور وہ یہ ہے کہ جب تک اپنے ذہن کو پہلے سے قائم شدہ نظریات، معتقدات اور تصورات سے پاک نہیں کرلیا جائے گا، قرآن سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (56:79) قرآنِ کریم کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ''جس کے قلب ونگاہ انسانی خیالات کی آمیزشوں سے پاک نہ ہوں، اسے قرآن سے کوئی مس نہیں ہوسکتا۔ انسانی قلب خدا کا مسکن بن نہیں سکتا جب تک اس حریم کعبہ سے انسانی فکر کے تراشیدہ بتوں کو نکال باہر نہ کیا جائے۔ جو شخص پہلے سے کوئی خیال قائم کرکے قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے اپنے اس خیال کی کسی نہ کسی طرح تائید مل جائے، تو اسے قرآن کی بارگاہ سے بُری طرح پھٹکار پڑتی ہے۔ مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

قرآن فہمی کے سلسلہ میں اہل عرب کی کیفیت اور ہماری تقلید پرستی

دماغ کو پہلے ان بتوں سے پاک کرنا چاہیے اور پھر دیکھیے کہ قرآنِ کریم کس طرح جلوہ پیرا ہوکر اس میں داخل ہوتا ہے! بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اہلِ عرب کی زبان تو عربی ہے۔ وہ بھی قرآن کو صحیح طور پر کیوں نہیں سمجھ پاتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کو غیر عرب مسلمانوں کی طرح تقلیداً سمجھتے ہیں یعنی کسی زمانے میں، کسی شخص نے، جس طرح قرآن کو سمجھا اور وہ آنے والوں کے لیے

سند اور حجت بن گیا۔ اس کے بعد یہ سوال ہی نہ رہا کہ قرآنِ کریم میں خود غور و فکر کیا جائے۔ یہ تقلیدی قرآن عربوں کو عربی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور غیر عربوں کو ترجموں کے ذریعے ان کی اپنی زبان میں۔ اپنی فکر سے نہ یہ قرآن کو سمجھتے ہیں' نہ وہ۔ اس لیے اس باب میں عرب اور عجم کی بھی کوئی تفریق نہیں رہی۔ تفسیر کی جو کتابیں الازہر میں پڑھائی جاتی ہیں' وہی دیوبند یا اب کراچی ملتان اور لاہور کے دارالعلوموں میں زیرِ تدریس رہتی ہیں۔ اپنی فکر و بصیرت نہ یہاں ہے' نہ وہاں۔

قرآنی رموز کو جاننے اور سمجھنے میں صدیوں سے حائل رکاوٹ

قرآن سمجھنے کے لیے سوال اہلِ زبان ہونے کا نہیں ہے۔ سوال زبان دانی کے بعد اہلِ فکر و نظر ہونے کا ہے۔ اپنے غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے قرآنِ کریم کو سمجھنے میں ایک بہت بڑی دشواری حائل ہوتی ہے۔ ہمارے اسلاف نے یعنی متقدمین نے جو تفسیریں لکھیں' اگر وہ ان کے متعلق یہ کہتے کہ یہ ان کا اپنا خیال ہے' اپنی رائے ہے' اپنا فہم ہے' تو ان سے اختلاف کی گنجائش ہو سکتی تھی۔ ایک انسان کے خیال سے دوسرا انسان اختلاف کر سکتا ہے۔ اس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہے' نہ جرم کی بات لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے جو تفسیر لکھی تو اس کے متعلق یہ کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی تفسیر ہے۔ ہمارے ہاں سب سے پہلی قرآنِ کریم کی تفسیر امام طبریؒ [1] کی تفسیر کہلاتی ہے۔ وہ بھی نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد تیسری صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ یہ پہلی مفصل قرآن کی تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ پھر انہوں نے کیا یہ ہے کہ ہر آیت کی تفسیر کے متعلق لکھا یہ ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ کی بیان فرمودہ تفسیر ہے۔ تب ہوا یہ کہ وہ طبری کی تفسیر نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر قرار پا گئی اور اس کے بعد آپ سوچیے کہ کس کی جرأت ہے کہ اس سے اختلاف کر سکے۔ جس تفسیر کے متعلق کہا جائے کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے' تو پھر وہ کون مسلمان ہے جو اس کے خلاف کوئی ایک لفظ بھی کہہ سکنے کی جرأت کر سکے۔ چنانچہ اس کے بعد آج تک جتنی تفسیریں لکھی گئیں' ان میں الفاظ کا فرق ہو گا' اندازِ بیان کا فرق ہو گا' اسلوب کا فرق ہو گا' تفصیل کا فرق ہو گا لیکن بنیادی طور پر معنویت کے اعتبار سے اس سے کوئی اختلاف نہ کر سکتا تھا' نہ کسی نے کیا ہے۔

امام طبریؒ اور امام بخاریؒ کی محنت کے ماحصل کا نتیجہ

یہ ساری تفسیریں جو ہزار سال کے زمانے میں لکھی گئی ہیں' یوں کہیے کہ امام طبریؒ کی تفسیر پر طرحی غزلیں ہیں' لیکن میں ابھی

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2004ء' ص ص 30 تا 31 نیز فٹ نوٹ 1

عرض کروں گا کہ وہ جو آیات کی تفسیر انہوں نے لکھی ہیں' وہ نبی اکرم ﷺ کی نہیں ہیں' وہ روایات پر مبنی ہیں اور روایات کے متعلق میں ابھی عرض کروں گا کہ وہ کس طرح سے وجود میں آئیں اور ان کے متعلق کوئی شخص بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقع نبی اکرم ﷺ کی ہیں۔ صورت تو یہ ہوئی لیکن اس سے امت کو جو نقصان پہنچا' وہ یہ ہے کہ ہزار سال پہلے طبرستان کے رہنے والے ایک امام طبریؒ تھے اور دوسرے امام بخاریؒ (260-194ھ)' وہ بھی بخارا کے ہی رہنے والے تھے۔ انہوں نے حدیث کا مجموعہ مرتب کیا اور امام طبری نے پہلی تفسیر مرتب کر دی۔ دونوں روایات پر مبنی ہیں' دونوں میں سے کسی کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہیں۔

طبریؒ کی تفسیر کے متعلق اختلاف کی ذرا سی گنجائش نکل سکتی تھی اگر نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی صحیح' یقینی تاریخ ہمارے پاس موجود ہوتی' لیکن وہ بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ امام طبریؒ نے جہاں قرآن کی تفسیر لکھی' وہیں اس زمانے کی تاریخ بھی لکھ دی: تفسیر تیس جلدوں میں' تاریخ تیرہ جلدوں کے اندر اور اس میں بھی ایک سند نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبار کی ہے۔ اب اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کیا یہ کہ جو تفسیر دی' اس تفسیر کی تائید میں تاریخی واقعہ لکھ دیا' جو تاریخی واقعہ لکھا اس کی تائید میں ایک تفصیلی روایت لکھ دی' تو اب اس کے بعد آپ کے ہاں نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی' ان کے عقیدے کے مطابق' قرآن کی تفسیر بھی مرتب ہو گئی اور اس دور کی تاریخ بھی مرتب ہو گئی۔ اب اس تفسیر سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا' اس تاریخ سے بھی کوئی اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس ہزار سال میں جس طرح سے اسلام کی یہ گاڑی اصلی پٹڑی سے دوسری پٹڑی پہ جا کے پڑ گئی ہے اُس میں بنیادی طور پر جو ذمے داری عائد ہوتی ہے' جو بنیادی سبب ہے' وہ یہی تفسیر' یہی تاریخ ہے' اسی نہج پر ہر ایک نے تفسیر لکھی تو اس کے بعد' جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا' کہ یہ جو روایات کی بنیادوں کے اوپر تفسیر یا تاریخ کہی جاتی ہے' یہ جو امت کے اندر اتنا زیادہ اختلاف پیدا ہو رہا ہے'۔ اس کی بنیاد ہی یہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ پہ قرآنِ کریم نازل ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ جس انداز سے حضور قرآن کریم کو سمجھ سکتے تھے' اس سے بہتر تو ایک طرف' اس سے الگ کون سا مسلمان قرآن کو سمجھ سکتا تھا' اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جو تفسیر ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ احادیث کے اندر ہے۔ اب احادیث کی صورت یہ ہے کہ نہ تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے دیا اور نہ ہی صحابہ کبار نے کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ احادیث کے پہلے مجموعے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے ڈھائی تین سو سال بعد جا کر مرتب ہوئے اور یہ کسی پہلے سے Written Material (تحریری مواد) پر مبنی نہیں ہیں' کسی تحریری سند یا مواد پر مبنی نہیں ہیں' بلکہ سب زبانی روایات پر مبنی ہیں۔ امام بخاریؒ نے زبانی روایت کو اپنے مجموعۂ حدیث میں شامل کر لیا۔ جن حدیث کی چھ کتابوں کو سنیوں [1] کے ہاں صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے' ان سب میں سرِ فہرست امام بخاریؒ کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''میں نے جب احادیث جمع کرنی شروع کیں' تو چھ لاکھ کے قریب روایات میں نے لوگوں سے سنیں۔ ان میں سے میں نے پانچ لاکھ چورانوے ہزار کو تو خود اپنی صوابدید کے مطابق مسترد کر دیا'

---

[1] ان نکات کی وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 199 تا 218، نیز فٹ نوٹ 1`2(200)۔

تو قریب چھ ہزار احادیث یا روایات رکھیں۔ ان میں سے بھی اگر جو مکرر بیان کی گئی ہیں' کو الگ کر دیا جائے' تو وہ قریباً تین ہزار رہتی ہیں'' لیکن یہ جو تین ہزار رہتی ہیں' ان میں بھی تو کسی روایت کو نہ نبی اکرم ﷺ کی سند ہے' نہ صحابہ کبار کی کوئی تصدیق ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری نے کسی سے سنا' انہوں نے اپنے باپ سے سنا' انہوں نے اپنے استاد سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں سے سنا' انہوں نے فلاں صحابی سے سنا' تو انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ ہر حدیث کا یہ انداز ہے۔

آپ سوچیے' عزیزانِ من! کہ نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد اس انداز سے' ان اسباب کے ذریعے سے' کہ فلاں نے فلاں سے سنا تھا' جو روایت بیان کی جائے گی' اس میں کہاں تک یقینی طور پر کہا جائے گا' کہ وہ رسول اللہ کی ہے۔ اسی لیے یہ جتنی حدیثیں ہیں' ان میں سے ہر حدیث کے بعد پہلے کہا جاتا ہے کہ ''قال رسول اللہ''۔ حضور نے فرمایا اور آخر میں کہا جاتا ہے ''اوکما قال رسول اللہ'' یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا ہے۔ یعنی خود یہ لوگ بھی یقینی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں' یہ رسول اللہ کی کہی ہوئی ہیں اور پھر یہ رسول اللہ کے الفاظ بھی نہیں ہے۔ حدیث کہتے ہیں کہ وہ معنوی طور پر آگے آئیں' یعنی ایک شخص نے یہ سمجھا' اُس نے آگے سمجھایا' اُس نے یہ سمجھا' اُس نے آگے سمجھایا اور دو سو سال کے بعد وہ شخص جس نے بیان کیا' اسے امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں لکھ لیا۔ اس طرح سے یہ احادیث کی چھ مستند کتابیں تو سنیوں کے ہاں ہیں اور اسی قسم کی چار مستند کتابیں شیعہ حضرات کے ہاں ہیں [1] اور کیفیت یہ ہے کہ ایک کتاب دوسری کتاب سے مختلف ہے یعنی خود ایک کتاب کے اندر بہت سے اختلافات ہیں۔ یہ ہیں عزیزانِ من! احادیث کے وہ مجموعے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں درج وہ احادیث رسول اللہ کی بیان فرمائی ہوئی ہیں۔

احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل کا فرمان

یہ اس قدر ناقابل اعتماد ہے کہ ان احادیث کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (164-241H/780-855AD) کا قول ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین قسم کی روایات قابل اعتماد نہیں: پیشین گوئیوں سے متعلق' لڑائیوں سے متعلق' اور تفسیر سے متعلق۔ ان کے اس قول کی تصدیق خود ان تفاسیر سے ہوتی ہے جنہیں نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مثالیں تو میں' اس میں بے شمار دے سکتا ہوں' لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے میں اس وقت اس کی صرف دو ایک مثالیں نہیں بلکہ ایک ہی مثال دینا کافی سمجھتا ہوں۔ وہ پیش کروں گا۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے گا کہ روایات کی رو سے قرآنِ کریم کے سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے۔

سورۂ احزاب میں ہے **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا** (33:69)۔ جماعت مومنین سے کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو بہت ستایا' انہیں اذیت دی' تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ان اذیت رسانیوں سے محفوظ رکھا۔ تم ان کی طرح نہ ہو جانا۔ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کس کس انداز سے ستاتے تھے' اس کی تفصیل قرآنِ کریم کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس غلام محکوم قوم کو فرعون [2] جیسے مستبد حاکم کی

---

[1] اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورہ حج' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص۔ 242-200۔

[2] اس کشمکش کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان' سورۃ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء

غلامی سے نجات دلا کر' وادیٔ سینا میں لے آئے تھے۔ یہی احسان کچھ کم گراں بہا نہیں تھا۔ اس قوم کو چاہیے تھا کہ قدم قدم پر ان کے شکر گزار ہوتے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ قدم قدم پر ان کو اذیت دیتے' ان کو تنگ کرتے۔ راستے میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک قوم ایک بت کی پرستش کرتی ہے' تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دامن پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہمیں بھی ایسا ایک بت بنا دیجیے تاکہ ہم اس کی پرستش کریں۔ کبھی ان کی کیفیت یہ ہے کہ پانی کی تنگی ہوئی ہے' تو جدھر گئے ہیں' انہوں نے کہا کہ موسیٰؑ تم ہمیں کہاں مارنے کے لیے لے آئے ہو۔ وہاں ان کو من وسلویٰ کھانے کو ملتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں تو یہاں بیٹھے ہوئے مصر میں' جو ہم اس قوم کی' اپنی حاکم قوم کی' ہنڈیاں پکایا کرتے تھے' اس کی لذتیں یاد آتی ہیں۔ ہمیں دالیں اور پیاز اور لہسن اور سبزیاں' یہ کچھ دو۔ یہ من وسلویٰ یہ ہم سے روز روز نہیں کھایا جاتا۔

آپ علیہ السلام چند دن کے لیے ذرا کہیں باہر گئے' سامری [1] نے ایک گئو سالہ بنایا اور انہوں نے اس کی پرستش شروع کر دی۔ وہ اس طرح ایک ایک قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستایا کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان سے کہا کہ **یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ** (61:5)۔ اے قوم! میں نے تمہارے ساتھ کون سی دشمنی کی ہے جس کی وجہ سے تم مجھے قدم قدم پر اس طرح ستاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں' اس کے پیغامات تم تک پہنچاتا ہوں' تمہیں تو اس کے لیے احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ ایک ایک قدم پر مجھے تنگ کرتے ہو' اذیتیں پہنچاتے ہو' اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے فریاد کی تھی کہ اے اللہ! میں اور میرا بھائی بس ہم یہ دونوں ہیں' جو اپنے ذمے دار ہیں' ورنہ یہ قوم فاسق ہے۔ جو کچھ یہ کر رہی ہے اس کی ذمے داری ہم پہ عائد نہیں ہوتی۔

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کی کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ جو قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ اے جماعت مومنین! تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح نہ ہو جانا' انہوں نے انہیں بڑا ستایا تھا اور ان کی اذیت رسانیوں کی تفصیل خود قرآن نے دی ہے' اس کی وضاحت ہو جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ایک روایت

اب آپ دیکھیے کہ اس آیت کی تفصیل روایات کی رو سے کیا ملتی ہے؟ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔ غور سے سنیے گا' عزیزانِ من! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل برہنہ غسل کرتے تھے۔ ایک دوسرے

---

[1] بچھڑے (گئو سالہ) اور سامری کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان، سورۂ طٰہٰ' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء ص ص 242 اور 250 اور فٹ نوٹ 1 (250)۔

کی طرف دیکھا جاتا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہا غسل کیا کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ واللہ! موسیٰ علیہ السلام کو ہم لوگوں کے ہمراہ غسل کرنے سے سوا اس کے کچھ مانع نہیں کہ وہ..... کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اتفاق سے ایک دن موسیٰ علیہ السلام غسل کرنے گئے اور اپنا لباس پتھر پر رکھ دیا۔ وہ پتھر ان کا لباس لے بھاگا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس کے تعاقب میں یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، اے پتھر! میرے کپڑے دے دے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف دیکھ لیا اور کہا واللہ! موسیٰ علیہ السلام کو کچھ بیماری نہیں ہے اور پتھر ٹھہر گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنا لباس لے لیا اور پتھر کو مارنے لگے۔ ابو ہریرہ t کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مار سے چھ یا سات نشان اب تک اس پتھر پر داخل ہیں۔

عزیز برادران! یہ بخاری شریف کی جلد اول کی روایت ہے جو قرآنِ کریم کی اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہے جس میں قرآنِ کریم نے جماعت مومنین سے کہا تھا کہ تم قوم موسیٰ کی طرح نہ ہو جانا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت ہی اذیتیں دی تھیں۔ اس روایت یا اس حدیث کے اندر اس اذیت رسانی کی تفسیر بیان ہو رہی ہے۔ کس قسم کی ہیں وہ تفاسیر جو احادیث کے اندر ہمیں ملتی ہیں۔ عزیزانِ من! ان کا آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی تفسیر روایات کی رو سے کی جانی چاہیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ حالانکہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ یہ روایات یا احادیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہیں۔ یہ آپ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور زبانی روایتیں کوئی دو سو اڑھائی سو سال کے بعد جمع کی گئی تھیں۔ اب کوئی نہیں کچھ کہہ سکتا کہ ان میں کتنا حصہ حضور ﷺ کا ہے اور کتنا کچھ دوسروں کا ملایا ہوا ہے۔

احادیث کے مجموعوں کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ ان میں جو باتیں قرآن کے مطابق ہیں، انہیں ہم صحیح تسلیم کر سکتے ہیں لیکن جو قرآن کے خلاف ہیں یا جن سے حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر کسی قسم کا طعن پڑتا ہے، ان کے متعلق ہم کہہ دیں گے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں نہیں ہو سکتیں۔ پھر سن لیجیے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کرتا۔ متذکرہ بالا مواد کی رو سے غلط روایات کے متعلق کہتا یہ ہوں کہ وہ رسول اللہ کی ہو نہیں سکتیں، ورنہ جو احادیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں، میں نے کبھی بھی اور کہیں بھی ان کا انکار نہیں کیا۔

عزیزانِ من! یہ ہیں سورۃ الفاتحہ کے ان دروس کے اسباب جو آپ کے سامنے پیش کیے گئے اور یہی ہے ان کی پہلی تعارفی نشست۔ اب سورۃ الفاتحہ ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀.....❀